سعادت حسن منٹو

آتش پارے

....میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا
اتاروں گا جو ہے ہی ننگی.... میں اسے کپڑے پہنانے کی
کوشش بھی نہیں کرتا، اسلئے کہ یہ میرا کام نہیں، درزیوں کا ہے....

آتش پارے

چند فکر طلب افسانوں کا مجموعہ

سعادت حسن منٹو

مکتبۂ شعروادب، سمن آباد، لاہور

جملہ حقوق بحق بیگم صفیہ منٹو محفوظ ہیں

ناشر .... نواز
مطبع .... حامد اینڈ کمپنی لاہور
قیمت .... اٹھارہ روپے

انتساب

والدِ مرحوم کے نام —:

دیباچہ

یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں - ان کو شعلوں میں تبدیل کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے -

امرتسر ۵ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء

سعادت حسن منٹو

خونی تھوک

گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔

مسافروں کے گروہ پلیٹ فارم کے سنگین سینے کو روندتے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ پھل بیچنے والی گاڑیاں ریٹائرڈ پہیّوں پر خاموشی سے تیر رہی تھیں۔ بجلی کے سینکڑوں قمقمے اپنی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے ایکدوسرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ برقی پنکھے سرد آہوں کی صورت میں اپنی ہوا پلیٹ فارم کی گدلی فضا میں بکھیر رہے تھے۔ دُور ریل کی پٹڑی کے پہلو میں ایک لیمپ اپنی سُرخ نگاہوں سے مسافروں کی آمدورفت کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا ۔۔۔۔ پلیٹ فارم کی فضا سگریٹ کے تند دھوئیں اور مسافروں کے شور میں لپٹی ہوئی تھی۔

پلیٹ فارم پر ہر ایک شخص اپنی اپنی دُھن میں مست تھا۔ تین چار بنچ پر بیٹھے اپنی ہونے والی سیر کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ایک گھڑی کے نیچے خدا معلوم کن خیالات میں غرق زیرِ لب گنگنا رہا تھا۔ دُور کونے میں نیا بیاہا ہوا جوڑا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ خاوند اپنی بیوی کو کچھ کھانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ وہ شرما کر مُسکرا دیتی تھی۔ پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر ایک نوجوان قلیوں کے ساتھ لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ جو اُسکی بہن کا تابوت اُٹھائے ہوئے تھے۔ پانچ چھ فوجی گورے ہاتھ میں چھڑیاں لئے اور سیٹی بجاتے ہوئے ریفریشمنٹ روم سے شراب پی کر نکل رہے تھے۔ بک سٹال پر چند مسافر اپنا وقت ٹالنے کی خاطر یونہی کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے میں مشغول تھے۔ بہت سے قلی سُرخ وردیاں پہنے گاڑی کی روشنی کا امید بھری نگاہوں سے انتظار کر رہے تھے —— ریفریشمنٹ روم کے اندر ایک صاحب انگریزی لباس زیب تن کئے سگار کا دھؤاں اڑا کر وقت کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"قلیوں کی زندگی گدھوں سے بھی بدتر ہے"

"مگر میاں کیا کریں آخر پیٹ کہاں سے پالیں"

"ایک قلی دن بھر میں کتنا کما لیتا ہوگا؟"

"یہی آٹھ دس آنے! ——"

"یعنی صرف جینے کا سہارا ___ اور اگر بال بچے ہوں ۔ تو اپنا پیٹ کاٹ کر ان کا منہ بھریں ۔ جب ان لوگوں کی تاریک زندگی کا خیال ایک دفعہ بھی میرے دماغ میں آ جائے ۔ تو پہروں یہی سوچتا رہتا ہوں ۔ کہ آیا اُن کی مصیبت ہماری نام نہاد تہذیب پر بدنما داغ نہیں ہے ؟ ___"

دو دوست پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے ۔ خالد اپنے دوست کی گفتگو سُن کر قدرے متعجب ہُوا اور مسکرا کر کہنے لگا :- "دیکھو میاں یہ لینن کب سے بنے تم ؟ ___ تہذیب کس بلا کا نام ہے ___ انسانیت کے سر د لو ہے پر جما ہُوا زنگ ! ___ جانے دو ایسی باتوں کو ، جانتے ہو میں پہلے ہی سے اپنے حواس کھوئے بیٹھا ہوں "

" خالد ! سچ کہہ رہے ہو ۔ یہ باتیں واقعی دماغ کو درہم برہم کر دیتی ہیں دو روز ہوئے اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ پندرہ مزدور کارخانے میں آگ لگ جانے کی وجہ سے جلے ہوئے کاغذ کے مانند راکھ ہو گئے ۔ کارخانہ بیمہ شدہ تھا ۔ مالک کو روپیہ مل گیا مگر پندرہ عورتیں بیوہ بن گئیں ۔ اور خدا معلوم کتنے بچے یتیم ہو گئے ۔ کل تین نمبر پلیٹ فارم پر ایک خاکروب کام کرتے کرتے گاڑی تلے آ کر مر گیا ۔ کسی نے آنسو تک نہ بہایا ___ جب سے یہ واقعہ دیکھا ہے طبیعت سخت مغموم ہے ۔ یقین جانو ، حلق سے روٹی کا لقمہ نیچے نہیں اُترتا ۔ جب دیکھو ، اُس خاکروب کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش

آنکھیں باہر نکالے میری طرف گھور رہی ہے ـــــ مجھے اُس کے گھر ضرور جانا چاہیئے۔ شاید میں اس کے بچّوں کی کچھ مدد کر سکوں"!

خالد مسکرایا۔ اور اپنے دوست کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا "جاؤ ـــ بیندرہ مزدوروں کی بیکس بیویوں کی بھی مدد کر دو، یہ ایک نیک اور مبارک جذبہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شہر سے کچھ فاصلے پر چند ایسے لوگ بھی آباد ہیں ـــــ جنہیں ایک وقت کے لئے سوکھی روٹی کا نصف ٹکڑا بھی میسّر نہیں۔ گلیوں میں ایسے بچے بھی ہیں جن کے سروں پر کوئی پیار دینے والا نہیں۔ ایسی سینکڑوں عورتیں موجود ہیں جن کا حُسن غربت کے کیچڑ میں گل سڑ رہا ہے ـــــ بتاؤ تم کس کس کی مدد کرو گے؟ ان پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سے کس کس کی مُٹھی بھرو گے؟ ـــــ ہزاروں ننگے جسموں میں سے کتنوں کی ستر پوشی کرو گے؟"

"آہ! درست کہتے ہو خالد!! ـــ درست کہتے ہو، مگر بتاؤ اس تاریک آندھی کو کس طرح روکا جا سکتا ہے؟ اپنے ہمجنس افراد کو ذلّت کی زندگی بسر کرتے دیکھنا، ننگے سینوں پر چمکتے ہوئے بوٹوں کی ٹھوکریں کھاتے دیکھنا ـــــ سخت بھیانک خواب ہے!"

"واقعات کی رفتار کا نتیجہ دیکھنے کا انتظار کرو۔ یہ لوگ اپنی طاقت کے باوجود اس طوفان کو نہیں روک سکتے۔ خود اعتمادی نے انہیں برداشت

کرنا سکھا دیا ہے ۔۔۔ چنگاریوں کو شعلوں میں تبدیل کر دینا آسان ہے مگر چنگاری کا پیدا کرنا بہت مشکل ہے ۔۔۔ بہر حال تمہیں امید رکھنی چاہیئے شاید تمہاری زندگی میں ہی مصائب کے یہ بادل دور ہو جائیں "۔

"میں یہ سہانا وقت دیکھنے کے لئے اپنی زندگی کے بقایا سال نذر کرنے کو تیار ہوں "۔

"کاش ، یہی خیال باقی لوگوں کے دلوں میں بھی موجود ہوتا ۔۔۔ مگر یار گاڑی آج کچھ دیر سے آتی معلوم ہوتی ہے ۔ دیکھو نا پٹڑی پر روشنی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا "۔

خالد کا ساتھی کسی گہری فکر میں غوطہ زن تھا ۔ اِس لئے اس نے اپنے دوست کے آخری الفاظ بالکل نہ سُنے ۔ اور اگر سُنے تو کچھ ادھ خیال کر کے کہنے لگا : " واقعی یہ خیال پیدا کرنا چاہیئے ۔ اور اگر ۔۔۔۔۔ "

" چھوڑو میاں اب اس فلسفے کو ۔۔۔ کچھ پتا بھی ہے ، گاڑی کب آنے والی ہے " خالد نے اپنے دوست کو بازو سے پکڑتے ہوئے کہا ۔

" گاڑی ۔۔۔ اور پھر سامنے والی گھڑی کی طرف نگاہ اٹھا کر " نو بجکر پچیس منٹ ! بس دس منٹ تک آجائے گی ۔۔۔۔ یعنی دس منٹ کے بعد ہمارا دوست ہمارے پاس ہوگا ۔۔۔ ذرا خیال تو کرو ۔ میں وحید کی آمد کو اس دردناک گفتگو کی وجہ سے بالکل بھول چکا تھا "

یہ کہتے ہوئے خالد کے دوست نے جیب سے سگریٹ نکالکر سُلگانا شروع کیا۔

پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ مسافر بڑی بے صبری سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ قلی اسباب کے ڈھیروں کے پاس خاموش کھڑے گاڑی کے منتظر تھے کہ جلد اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک آنہ حاصل کر سکیں۔ خوانچہ والے دوسرے پلیٹ فارموں سے جمع ہو کر اپنی اپنی مخصوص صدا بلند کر رہے تھے ــــ فضا گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ، مختلف انجنوں کی پھپ پھپ؛ خوانچہ والوں کی صداؤں، مسافروں کی باہم گفتگو کے شور اور قلیوں کی بھدی آوازوں سے معمور تھی ــــ برقی پنکھے بدستور سرد آہیں بھر رہے تھے۔

ریفرشمنٹ روم کے اندر بیٹھے ہوئے مسافر نے جو ابھی تک سگار کو دانتوں میں دبائے کش کھینچ رہا تھا۔ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف بڑی بے پروائی کے انداز میں دیکھا۔ اور بازو کو جھٹکا دے کر مرمریں میز پر سہارا دیتے ہوئے بلند آواز میں بولا:۔

”بوائے“

تھوڑی دیر خادم کا انتظار کرنے کے بعد وہ پھر چیخا:۔

”بوائے ــــ بوائے۔ اور پھر آہستہ بڑبڑاتے ہوئے ”نمکحرام!“

" جی کیا حضور!" دوسرے کمرے میں سے کسی کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی سپید لباس پہنے ہوئے ایک خادم بھاگ کر اس مسافر کے قریب مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"حضور!"

"ہم نے تمہیں دو دفعہ آواز دی۔ سوئے رہتے ہو تم لوگ شاید!"

"حضور، میں نے سنا نہیں۔ ورنہ کیا مجال ہے کہ غلام حاضر نہ ہوتا"۔

غلام کا لفظ سن کر مسافر کا غصہ فرو ہو گیا۔

"دیکھو درجہ اوّل کے مسافروں سے یہ بے رُخی اچھی نہیں۔ ہم تمہارے بڑے صاحب کے بھی کان کھینچ سکتا ہے، سمجھے؟"

"جی ہاں"

" ایجنٹ کے، وہ ہمارا دوست ہے ——— خیر! دیکھو تم ویٹنگ روم میں جاؤ اور ہمارے قلی سے کہو۔ کہ وہ صاحب کا تمام اسباب پلیٹ فارم پر لے جائے۔ گاڑی آنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں"

" بہت اچھا حضور"

" اور ہاں، ہمارا بل دوسرے آدمی کے ہاتھ بھجوا دو"

" بہت اچھا صاحب!"

" دیکھو! ——— بل میں پانچسو پچپن نمبر سگریٹ کے ایک ڈبے کے

دام بھی شامل کرلینا ـــــ پانچسو پچپن نمبر کا ڈبہ خیال رہے "
"بل اور ڈبہ گاڑی میں لے کر حاضر ہو جاؤں گا ۔ وقت تھوڑا ہی"
"جو مرضی میں آئے کرنا، مگر اب تم جاؤ اور جلد ہمارے قلی کو اسباب نکالنے کے لئے کہدو"

مسافر نے یہ کہکر ایک انگڑائی لی اور میز پر پڑے ہوئے شراب کے گلاس میں سے آخری گھونٹ ایک ہی جرعے میں ختم کر دیئے گیلے ہونٹ ایک بے داغ ریشمی رومال سے صاف کرنے کے بعد وُہ اُٹھا ۔ اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا ۔

صاحب کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھکر ایک خادم نے جلدی سے دروازہ کھول دیا ۔ مسافر بڑی رعونت سے ٹہلتا ٹہلتا پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہوگیا ۔

دُور ریل کی آہنی پٹڑیوں کے درمیان خیرہ کُن روشنی کا ایک دھبّہ نظر آرہا تھا ۔ جو آہستہ آہستہ آس پاس کی تاریکی کو چیرتا ہوا بڑھ رہا تھا ۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ دھبّہ روشنی کی ایک لانبی دھار میں تبدیل ہوگیا ۔ اور دفعتاً انجن کی چوندھیا دینے والی روشنی ایک لمحے کے لئے پلیٹ فارم کے قمقموں کو اندھا بناتے ہوئے گل ہوگئی ۔ ساتھ ہی کچھ عرصہ کے لئے انجن کے آہنی پہیوں کی بھاری گڑگڑاہٹ تلے پلیٹ فارم کا

شور دب کر رہ گیا ــــ ایک چیخ کے ساتھ گاڑی شنٹن کے سنگین
چبوترے کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔
پلیٹ فارم کا دبا ہوا شور انجن کی گڑگڑاہٹ سے آزاد ہو کر
ایک نئی تازگی سے بلند ہوا۔ مسافروں کی دوڑ دھوپ، بچوں کے رونے
کی آواز، قلیوں کی بھاگ دوڑ، اسباب نکالنے کا شور، ٹھیلوں کی
کھڑکھڑاہٹ، خوانچے والوں کی بلند صدائیں، شنٹ کرتے ہوئے انجن
کی دلخراش چیخیں اور بھاپ نکلنے کی شاں شاں، پلیٹ فارم کی آہنی
چھت تلے فضا میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے تیر رہی تھیں۔
"خالد! ــــ وحید کو دیکھا تم نے کسی ڈبے میں؟"
"نہیں تو!"
"خدا جانے اس گاڑی سے آیا بھی ہے یا نہیں"
"تار میں تو اسی گاڑی کا ذکر تھا ــــ ارے، وہ ڈبے میں کون
ہے ــــ وحید!"
"ہاں، ہاں وحید!"
دونوں دوست بھاگتے ہوئے اس ڈبے کی طرف بڑھے جس
میں سے وحید اپنا اسباب اُتروا رہا تھا۔
ریفرشمنٹ روم والا مسافر تیزی سے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ

کی طرف بڑھا۔ باہر دروازے کے ساتھ لگے ہوئے کاغذ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر داخل ہو گیا۔ اور ہتیل کی سلاخ تھام کر۔ قلّی اور اپنے اسباب کا انتظار کرنے لگا۔

قلّی اسباب سے لدا ہوا گاڑی کے ڈبوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دوڑا چلا آرہا تھا۔ مسافر نے اُسے۔ جھلّا کر بلند آواز میں پکارا۔

"ابے اندھے، اِدھر آ۔"

قلّی نے مسافر کی آواز پہچان کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مگر بھیڑ میں خود مسافر کو نہ دیکھ سکا۔ وہ ابھی اسی پریشانی کی حالت میں ہی تھا کہ ایک اور آواز آئی۔

"کیوں، نظر نہیں آرہا کیا؟ اِدھر اِدھر۔۔۔۔ ناک کی سیدھ!"

قلّی نے مسافر کو دیکھ لیا۔ اور اسباب لیکراس کے ڈبے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب، ایک طرف ہٹ جائیے، میں اسباب اندر رکھدوں۔"

"ہاں رکھو۔" دروازے کے ساتھ ایک گدے دار نشست پر بیٹھتے ہوئے "مگر اتنا عرصہ سوئے رہے تھے کیا؟ خانسامے نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ صاحب کا سامان اٹھا کر گاڑی آتے ہی فوراً ڈبے میں رکھدینا؟"

" مجھے معلوم نہیں تھا، کہ آپ کس ڈبے میں سوار ہونگے "۔ قلی نے ایک بھاری ٹرنک اٹھا کر بالائی نشست پر رکھتے ہوئے کہا۔

" یہ ڈبہ ہمارا ریزرو کرایا ہوا ہے۔ باہر چٹ پر نام بھی لکھا ہوا ہے "۔

" آپ نے پہلے یہ کہا ہوتا تو ہرگز یہ دیر نہ ہوتی ——— ایک، دو تین... آٹھ — اور، دس، قلی نے اسباب کی مختلف اشیاء گننا شروع کردیں۔

سامان قرینے سے رکھنے کے بعد قلی نے اپنے اطمینان کے لئے ایک بار رکھی ہوئی چیزوں پر نگاہ ڈالی۔ اور ڈبے سے نیچے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔

" صاحب اپنا سامان پورا کر لیجئے "۔

مسافر نے بڑی بے پروائی سے اپنی جیب سے ایک نفیس بٹوہ نکالا اور ابھی کھول کر مزدوری ادا کرنے والا ہی تھا کہ اُسے کچھ یاد آیا۔

" ہماری چھڑی کہاں ہے "؟

" چھڑی ؟ ——— چھڑی تو آپ کے پاس ہی تھی "۔

" میرے پاس، بکتا کیا ہے ——— وہیں چھوڑ آیا ہوگا تو "

" چھڑی آپ کے پاس تھی ——— مگر صاحب اس سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں۔ جب میں نے کوئی خطا ہی نہیں کی ——— "

قلی کی زبان سے اس قسم کے الفاظ سُنکر مسافر آگ بھبھو کا ہوگیا۔ اور اپنی جگہ سے اُٹھکر دروازے کے پاس کھڑا ہو کر چلّانے لگا :۔
" سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں ـــــ کسی نواب کا صاحبزادہ ہے! ـــــ جتنے کی چھڑی ہے اُتنی تو تیری قیمت بھی نہیں ـــــ چھڑی لے کر آتا ہے یا نہیں ؟ ـــــ چور کہیں کا! "
چور کے لفظ نے قلی کے دل میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ اُس کے جی میں آئی۔ کہ اس مسافر کو ٹانگ سے پکڑ کر نیچے کھینچ لے۔ اور اُسے اس اکڑفوں کا مزا چکھا دے۔ مگر طبیعت پر قابو پاکر خاموش ہوگیا اور نرمی سے کہنے لگا :۔
" آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ چھڑی آپ نے کہیں رکھ دی ہوگی مجھے بتائیے میں وہاں سے اٹھا لے آؤں "
" گویا میں بے وقوف ہوں ـــــ میں کہہ رہا ہوں، چھڑی لے کر آؤ ورنہ ساری شیخی کر کری کر دوں گا "
قلی ابھی کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اُسے چند قدم کے فاصلے پر خانساماں نظر آیا۔ جو ہاتھ میں سگریٹ کا ڈبہ اور چھڑی پکڑے چلا آ رہا تھا۔
" چھڑی خانساماں لے کر آرہا ہے۔ اور آپ خواہ مخواہ مجھ پر برس

رہے ہیں !"

"بکو نہیں اب ـــــ کتّے کی طرح چلّائے جارہا ہے۔"

یہ سُن کر قلی غصّے سے بھرا ہوا مسافر کی طرف بڑھا۔ مسافر نے پوری زور سے اس کے بڑھتے ہوئے سینے میں نوکیلے بوٹ سے ٹھوکر لگائی ٹھوکر کھاتے ہی قلی چکرا تا ہوا سنگین فرش پر گر کر بیہوش ہوگیا۔

قلی کو گرتے دیکھکر بہت سے لوگ اسکے ادھر ادھر جمع ہوگئے۔

"بیچارے کو بہت سخت چوٹ آئی ہے"

"یہ لوگ بہانہ بھی کیا کرتے ہیں"

"منہ سے شاید خون بھی نکل رہا ہے"

"معاملہ کیا ہے ؟"

"اس آدمی نے اسے بوٹ سے ٹھوکر لگائی ہے"

"کہیں مر نہ جائے بیچارہ"

"کوئی دوڑکر پانی کا ایک گلاس تو لائے"

"بھئی ایک طرف ہٹ کر کھڑے رہو۔ ہوا تو آنے دو"

قلی کے گرد جمع ہوتے ہوئے لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد خالد اور اُس کا دوست بھیڑ چیرتے ہوئے مزدور کے قریب پہنچے۔ خالد نے اس کے سر کو اپنے گھٹنوں

بر اُٹھالیا - اور اخبار سے ہوا دینا شروع کردی - پھر اپنے دوست سے مخاطب ہو کر بولا :-

"مسعود وحید سے کہہ دو کہ ہم اب اُسے گھر پر ہی مل سکینگے ---- اور ہاں ذرا اس ظالم کو تو دیکھنا - کہاں ہے ---- گاڑی چلنے والی ہے - کہیں وہ چلا نہ جائے "

یہ سنتے ہی لوگ اُس مسافر کے ڈبے کے پاس جمع ہوگئے - جو کھڑکی کے پاس بیٹھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار پڑھنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا -

مسعود اپنے دوست وحید سے رخصت لیکر اس مسافر کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے قریب جاکر نہایت شائستگی سے کہا :-

"آپ یہاں اخبار بینی میں مصروف ہیں - اور وہ بیچارہ بیہوش پڑا ہے"

" پھر میں کیا کروں" ؟

" چلئے اور کم از کم اسکی حالت کا ملاحظہ تو کیجئے "

"کمبخت نے میرے سفر کا تمام لطف غارت کر دیا ہے " اور پھر دروازے سے باہر نکلتے ہوئے " چلئے صاحب ---- مصیبت بھی تھی "

تا لالہ بیہوش تلی کا سر تھامے اُسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا

تھا۔ لوگ جھکے ہوئے خالد اور قلی کے چہروں کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

"خالد! آپ تشریف لے آئے ہیں۔ مسعود نے مسافر کو آگے بڑھنے کو کہا۔

"ہاں، جناب ـــــ یہ ہے آپ کے ظلم کا شکار ـــــ کسی ڈاکٹر کو ہی بلوالیا ہوتا آپ نے"؟ مسعود نے مسافر سے کہا۔

مسافر قلی کے زرد چہرہ اور لوگوں کا گروہ دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوا۔ اور گھبراتے ہوئے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا۔

مسافر ابھی بٹوہ نکال رہا تھا کہ قلی کا جسم متحرک ہوا۔ اور اس نے اپنی آنکھیں کھول کر ہجوم کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

"یہ نوٹ آپ اُسے میری طرف سے دے دیجئیگا ـــــ میں چلتا ہوں گاڑی کا وقت ہوگیا ہے"۔ مسافر نے مسعود کے ہاتھ میں دس روپے کا ایک نوٹ پکڑاتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ اور پھر قلی کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس سے مخاطب ہوا "ہم نے اس غلطی کی قیمت ادا کر دی ہے"۔

قلی یہ سنکر تڑپا۔ منہ سے خون کی ایک دھار نکلی۔ بڑی کوشش سے اس نے یہ چند الفاظ اپنی زخمی چھاتی پر زور دے کر نکالے:۔

"میں بھی انگریزی زبان جانتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دس روپے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک انسان کی جان کی قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے پاس بھی کچھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

باقی الفاظ اس کے خون بھرے مُنہ میں بُلبلے بنکر رہ گئے ۔ مسافر قلی کی یہ حالت دیکھکر اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور اس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا :۔

"میں زیادہ بھی دے سکتا ہوں ـــــ"

قلی نے بڑی تکلیف سے مسافر کی طرف رُخ پھیرا ۔ اور مُنہ سے خون کے بُلبلے نکالتے ہوئے کہا :۔

"میرے پاس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لو ۔ ۔ ۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے مسافر کے مُنہ پر تھوک دیا ۔ تڑپا ۔ اور پلیٹ فارم کی آہنی چھت کی طرف مظلوم نگاہوں سے دیکھتا ہوا خالد کی گود میں سرد ہو گیا ـــــ مسافر کا منہ خونی تھوک سے رنگا ہوا تھا ۔

خالد اور مسعود نے لاش دوسرے آدمیوں کے حوالہ کر کے مسافر کو پکڑ کر پولیس کے سپرد کر دیا ۔

مسافر کا مقدمہ دو مہینے تک متواتر عدالت میں چلتا رہا۔

آخر فیصلہ سنا دیا گیا۔ فاضل جج نے ملزم کو معمولی جرمانہ کرنے کے بعد بری کر دیا فیصلے میں یہ لکھا تھا کہ قلی کی موت اچانک تلی پھٹ جانے سے واقع ہوئی ہے۔

فیصلہ سناتے وقت خالد اور مسعود بھی موجود تھے۔ ملزم اُن کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

" قانون کا قفل صرف طلائی چابی سے کھل سکتا ہے "

" مگر ایسی چابی ٹوٹ بھی جایا کرتی ہے "

خالد اور اس کا دوست باہر برآمدے میں باہم گفتگو کر رہے تھے۔

اشاعت اولیں:۔
"ساقی"

انقلاب پسند

میری اور سلیم کی دوستی کو پانچسال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس زمانے میں ہم نے ایک ہی سکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا، ایک ہی کالج میں داخل ہوئے اور ایک ہی ساتھ ایف اے کے امتحان میں شامل ہو کر فیل ہو گئے۔ پھر پرانا کالج چھوڑ کر ایک نئے کالج میں داخل ہوئے — اس سال میں تو پاس ہو گیا۔ مگر سلیم سوئے قسمت سے پھر فیل ہو گیا۔

سلیم کی دوبارہ ناکامیابی سے لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ وہ آوارہ مزاج اور نالائق ہے — یہ بالکل افترا ہے۔ سلیم کا بغلی دوست ہونے کی حیثیت سے میں بہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ سلیم کا دماغ بہت

روشن ہے۔ اگر وہ کالج کی پڑھائی کی طرف ذرا بھی توجہ دیتا۔ تو کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ وہ صوبہ بھر میں اوّل نہ رہتا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے پڑھائی کی طرف کیوں توجّہ نہ دی؟

جہاں تک میرا ذہن کام دیتا ہے مجھے اسکی تمام تر وجہ وُہ خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ جو ایک عرصے سے اس کے دل و دماغ پر آہستہ آہستہ چھا رہے تھے۔

دسویں جماعت اور کالج میں داخل ہوتے وقت سلیم کا دماغ اُن تمام اُلجھنوں سے آزاد تھا جس نے اُسے ان دنوں پاگل خانے کی چار دیواری میں مقید کر رکھا ہے۔ ایام کالج میں وہ دیگر طلبہ کی طرح ہر کھیل کود میں حصّہ لیا کرتا تھا۔ سب لڑکوں میں ہر دلعزیز تھا مگر یکایک اس کے والد کی ناگہانی موت نے اس کے متبسّم چہرے پر غم کی نقاب اُڑھا دی —— اب کھیل کود کی جگہ غور و فکر نے لے لی۔

وہ کیا خیالات تھے، جو سلیم کے مضطرب دماغ میں پیدا ہوئے؟ —— یہ مجھے معلوم نہیں۔ سلیم کی نفسیات کا مطالعہ کرنا بہت اہم کام ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود اپنی دلی آواز سے ناآشنا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ گفتگو کرتے وقت یا یونہی سیر کرتے ہوئے اچانک میرا بازو پکڑ کر کہا ہے "عباس جی چاہتا ہے کہ ...... !"

"ہاں۔ہاں، کیا جی چاہتا ہے۔ میں نے اسکی طرف تمام توجہ مبذول کرکے پوچھا ہے۔ مگر میرے اس استفسار پر اس کے چہرے کی غیر معمولی تبدیلی اور گلے میں سانس کے تصادم نے صاف طور پر ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنے دلی مدعا کو خود نہ پہچانتے ہوئے الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔

وہ شخص جو اپنے احساسات کو کسی شکل میں پیش کرکے دوسرے ذہن پر منتقل کر سکتا ہے۔ وہ دراصل اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی قدرت کا مالک ہے۔ اور وہ شخص جو محسوس کرتا ہے مگر اپنے احساس کو خود آپ اچھی طرح نہیں سمجھتا۔ اور پھر اس اضطراب کو بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اس شخص کے مرادف ہے۔ جو اپنے حلق میں پھنسی ہوئی چیز کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہو، مگر وہ گلے سے نیچے اُترتی چلی جا رہی ہو——— یہ ایک ذہنی عذاب ہے۔ جس کی تفصیل لفظوں میں نہیں آسکتی۔

سلیم شروع ہی سے اپنی آواز سے ناآشنا رہا ہے۔ اور یہ ہونا بھی تھا کیونکہ جب اس کے سینے میں خیالات کا ایک ہجوم چھایا رہتا تھا بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ بیٹھا بیٹھا اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور کمرے میں چکر لگا کر لمبے لمبے سانس بھرنے شروع کر دیئے ——— غالبًا وہ اپنے اندر کی انتشار سے تنگ آ کر اُن خیالات کو جو اس کے سینے میں بھاپ کی مانند

جکڑ لگا رہے ہوتے ۔ سانسوں کے ذریعے باہر نکالنے کا کوشاں ہؤا کرتا تھا ۔ اضطراب کے انہی تکلیف دہ لمحات میں اس نے اکثر اوقات مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ہے " عباس! یہ خاکی کشتی کسی روز تند موجوں کی تاب نہ لا کر چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی ۔۔۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ "

وہ اپنے اندیشے کو پوری طرح بیان نہیں کر سکتا تھا ۔

سلیم کسی متوقع حادثے کا منتظر ضرور تھا ۔ مگر اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ حادثہ کس شکل میں پردۂ ظہور پر نمودار ہو گا ۔۔۔ اسکی نگاہیں ایک عرصے سے دُھندلے خیالات کی صورت میں ایک موہوم سایہ دیکھ رہی تھیں ۔ جو اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا ۔ مگر وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس تاریک شکل کے پردے میں کیا نہاں ہے ۔

میں نے سلیم کی نفسیات سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے ۔ مگر مجھے اسکی منقلب عادات کے ہوتے ہوئے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کن گہرائیوں میں غوطہ زن ہے ۔ اور وہ اس دنیا میں رہ کر اپنے مستقبل کے لئے کیا کرنا چاہتا ہے ۔ جبکہ اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ ہر قسم کے سرمائے سے محروم کر دیا گیا تھا ۔

میں ایک عرصے سے سلیم کو منقلب ہوتے دیکھ رہا تھا ۔ اسکی عادات دن بدن بدل رہی تھیں ۔۔۔ کل کا کھلنڈرا لڑکا ، میرا ہم جماعت ایک

منظر میں تبدیل ہو رہا تھا ــــــــــــ یہ تبدیلی میرے لئے سخت باعث حیرت تھی۔

کچھ عرصے سے سلیم کی طبیعت پر ایک غیر معمولی سکون چھا گیا تھا۔ جب دیکھو اپنے گھر میں خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ اور اپنے بھاری سر کو گھٹنوں میں تھامے کچھ سوچ رہا ہے ـــــ وہ کیا سوچ رہا ہوتا۔ یہ میری طرح خود اُسے بھی معلوم نہ تھا۔ ان لمحات میں میں نے اسے اکثر اوقات اپنی گرم آنکھوں پر دوات کا آہنی ڈھکنا یا گلاس کا بیرونی حصّہ پھیرتے دیکھا ہے ـــــ شاید وہ اس عمل سے اپنی آنکھوں کی حرارت کم کرنا چاہتا تھا۔

سلیم نے کالج چھوڑتے ہی غیر ملکی مصنفوں کی بھاری بھر کم تصانیف کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ شروع شروع میں مجھے اسکی میز پر ایک کتاب نظر آئی۔ پھر آہستہ آہستہ اُس الماری میں جس میں وہ شطرنج، تاش اور اسی قسم کی دیگر کھیلیں رکھا کرتا تھا۔ کتابیں ہی کتابیں نظر آنے لگیں ــــ ــــ اس کے علاوہ وہ کئی کئی دنوں تک گھر سے کہیں باہر چلا جایا کرتا تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے سلیم کی طبیعت کا غیر معمولی سکون اُن کتابوں کے انتھک مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ جنہیں اُس نے بڑے قرینے

سے الماری میں سجا رکھی تھیں۔

سلیم کا عزیز ترین دوست ہونے کی حیثیت میں میں اس کی طبیعت کے غیر معمولی سکون سے سخت پریشان تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ سکون کسی وحشت خیز طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے علاوہ مجھے سلیم کی صحت کا بھی بہت خیال تھا۔ وہ پہلے ہی بہت کمزور جُثّے کا واقع ہُوا تھا۔ اس پر اس نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو خدا معلوم کن کن اُلجھنوں میں پھنسا لیا تھا۔ سلیم کی عمر بمشکل بیس سال کی ہوگی۔ مگر اس کی آنکھوں کے نیچے شب بیداری کی وجہ سے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ پیشانی جو اس سے قبل بالکل ہموار تھی اب اسپرنگ شکن پڑے رہتے تھے۔۔۔ جو اس کی ذہنی پریشانی کو ظاہر کرتے تھے۔ چہرہ جو کچھ عرصہ پہلے بہت شگفتہ ہُوا کرتا تھا۔ اب اس پر ناک اور لبوں کے درمیان گہری لکیریں پڑ گئی تھیں۔ جنہوں نے سلیم کو قبل از وقت معمّر بنا دیا تھا۔۔۔۔ اس غیر معمولی تبدیلی کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے۔ جو مجھے ایک شعبدے سے کم معلوم نہیں ہوتی۔۔۔ یہ کیا کم تعجب کی بات ہے۔ کہ میری عمر کا لڑکا میری نظروں کے سامنے بوڑھا ہو جائے۔

سلیم پاگل خانے میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ سڑی اور دیوانہ ہے۔ اُسے غالباً اس بنا پر

پاگل خانے بھیجا گیا ہے کہ وہ بازاروں میں بلند بانگ تقریریں کرتا ہے۔ راہ گذروں کو پکڑ پکڑ کر انہیں زندگی کے مشکل مسائل بتا کر جواب طلب کرتا ہے۔ اور امراء کے حریر پوش بچوں کا لباس اتار کر ننگے بچوں کو پہنا دیتا ہے ـــــ ممکن ہے۔ یہ حرکات ڈاکٹروں کے نزدیک دیوانگی کی علامتیں ہوں مگر میں تیقن کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سلیم پاگل نہیں ہے۔ بلکہ وہ لوگ جنہوں نے اُسے امن عامہ میں خلل ڈالنے والا تصور کرتے ہوئے آہنی سلاخوں کے پنجرے میں قید کر دیا ہے کسی دیوانے حیوان سے کم نہیں ہیں!

اگر وہ اپنی غیر مربوط تقریر کے ذریعے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔ تو کیا ان کا فرض نہیں کہ وہ اس کے ہر لفظ کو غور سے سنیں؟ اگر وہ راہ گذروں کے ساتھ فلسفۂ حیات پر تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہے۔ تو کیا اس کے یہ معنی لئے جائینگے کہ اس کا وجود مجلسی دائرہ کے لئے نقصان دہ ہے؟ ـــــ کیا زندگی کے حقیقی معانی سے باخبر ہونا ہر انسان کا فرض نہیں ہے؟

اگر وہ متمول اشخاص کے بچوں کا لباس اُتار کر غُربا کے برہنہ بچوں کا تن ڈھانپتا ہے ـــــ تو کیا یہ عمل اُن افراد کو اُن کے فرائض سے آگاہ نہیں کرتا جو فلک بوس عمارتوں میں دوسرے لوگوں کے بل بوتے پر آرام کی

زندگی بسر کر رہے ہیں؟ ــــ کیا ننگوں کی ستر پوشی کرنا ایسا فعل ہے کہ اِسے دیوانگی پر محمول کیا جائے؟

سلیم ہرگز پاگل نہیں ہے۔ مگر مجھے یہ تسلیم ہے کہ اسکے افکار نے اُسے بے خود ضرور بنا رکھا ہے ۔ دراصل وُہ دنیا کو کچھ پیغام دینا چاہتا ہے۔ مگر دے نہیں سکتا۔ ایک کمسن بچے کی طرح وہ تتلا تتلا کر اپنے قلبی احساسات بیان کرنا چاہتا ہے۔ مگر الفاظ اسکی زبان پر آتے ہی بکھر جاتے ہیں۔

وہ اس سے قبل ذہنی اذیت میں مبتلا ہے مگر اب اُسے اور اذیت میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہ پہلے ہی سے اپنے افکار کی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ اور اب اُسے زندان نما کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا ہے ــــ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟

میں نے آجتک سلیم کی کوئی بھی ایسی حرکت نہیں دیکھی جس سے میں یہ نتیجہ نکال سکوں۔ کہ وہ دیوانہ ہے۔ ہاں البتہ کچھ عرصے سے میں اس کے ذہنی انقلابات کا مشاہدہ ضرور کر رہا ہوں۔

شروع شروع میں جب میں نے اس کے کمرے کے تمام فرنیچر کو اپنی اپنی جگہ سے ہٹا ہوا پایا۔ تو میں نے اس تبدیلی کی طرف خاص توجہ نہ دی دراصل میں نے اس وقت جو خیال کیا۔ کہ شاید سلیم نے فرنیچر کی موجودہ جگہ

کو زیادہ موزوں خیال کیا ہے - اور حقیقت تو یہ ہے کہ میری نظروں کو جو کرسیوں اور میزوں کو کئی سالوں سے ایک جگہ دیکھنے کی عادی تھیں۔ وُہ غیر متوقع تبدیلی بہت بھلی معلوم ہوئی -

اس واقعے کے چند روز بعد جب میں کالج سے فارغ ہو کر سلیم کے کمرے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نامی مشقوں کی دو تصاویر جو ایک عرصے سے کمرے کی دیواروں پر آویزاں تھیں - اور جنہیں میں اور سلیم نے بہت مشکل کے بعد فراہم کیا تھا - باہر نوکری میں پھٹی پڑی ہیں - اور ان کی جگہ انہی چوکھٹوں میں مختلف مصنفوں کی تصویریں لٹک رہی ہیں ـــــ چونکہ میں خود ان تصاویر کا اتنا مشتاق نہ تھا - اسلئے مجھے سلیم کا یہ انتخاب بہت پسند آیا - چنانچہ ہم اس روز دیر تک ان تصویروں کے متعلق گفتگو بھی کرتے رہے -

جہاں تک مجھے یاد ہے اس واقعہ کے بعد سلیم کے کمرے میں ایک ماہ تک کوئی خاص قابلِ ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوئی - مگر اس عرصے کے بعد میں نے ایک روز اچانک کمرے میں بڑا سا تخت پڑا پایا ـــ جس پر سلیم نے کپڑا بچھا کر کتابیں چن رکھیں - اور آپ قریب ہی زمین پر ایک تکیہ کا سہارا لئے کچھ لکھنے میں مصروف تھا - میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہُوا - اور کمرے میں داخل ہوتے ہی سلیم سے یہ سوال کیا - کیوں میاں! اس تخت کے کیا معنی؟

سلیم، جیسا کہ اسکی عادت تھی مسکرایا اور کہنے لگا "کرسیوں پر روزانہ بیٹھتے بیٹھتے طبیعت اُکتا گئی ہے۔ اب یہ فرش والا سلسلہ ہی رہے گا۔"
بات معقول تھی۔ میں چُپ رہا۔ واقعی روزانہ ایک ہی چیز کا استعمال کرتے کرتے طبیعت ضرور اُچاٹ ہو جایا کرتی ہے۔ مگر جب پندرہ بیس روز کے بعد میں نے وہ تخت مع تکیئے کے غائب پایا۔ تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور مجھے شبہ سا ہُوا کہیں میرا دوست واقعی خبطی تو نہیں ہو گیا ہے۔
سلیم سخت گرم مزاج واقع ہُوا ہے۔ اسکے علاوہ اس کے ذہنی افکار نے اُسے معمول سے زیادہ چڑچڑا بنا رکھا تھا۔ اسلئے میں عموماً اس سے ایسے سوالات نہیں کیا کرتا۔ جو اس کے دماغی توازن کو درہم برہم کردیں یا جن سے وہ خواہ مخواہ کھج جائے۔
فرنیچر کی تبدیلی، تصویروں کا انقلاب، تخت کی آمد اور پھر اس کا غائب ہو جانا واقعی کسی حد تک تعجب خیز ضرور ہیں۔ اور واجب تھا کہ میں ان امور کی وجہ دریافت کرتا۔ مگر چونکہ مجھے سلیم کو آزردہ خاطر کرنا، اور اس کے کام میں دخل دینا منظور نہ تھا۔ اسلئے میں خاموش رہا۔
تھوڑے عرصے کے بعد سلیم کے کمرے میں ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی تبدیلی دیکھنا میرا معمول ہو گیا ۔۔۔ اگر آج کمرے میں تخت

موجود ہے۔ تو ہفتے کے بعد وہاں سے اُٹھا دیا گیا ہے۔ اس کے دو روز بعد وُہ میز جو کچھ عرصہ پہلے کمرے کے دائیں طرف پڑی تھی۔ رات رات میں وہاں سے اٹھا کر دوسری طرف رکھدی گئی ہے۔ انگیٹھی پر رکھی ہوئی تصاویر کے زاوئیے بدلے جارہے ہیں۔ کپڑے لٹکانے کی کھونٹیاں ایک جگہ سے اُکھڑ کر دوسری جگہ پر جڑ دی گئی ہیں۔ کرسیوں کے رُخ تبدیل کئے گئے ہیں ـــــ گویا کمرے کی ہر شئے سے ایک قسم کی قواعد کرائی جاتی تھی۔

ایک روز جب میں نے کمرے کے تمام فرنیچر کو مخالف رُخ میں پایا توُمجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے سلیم سے دریافت کر ہی لیا۔ سلیم میں ایک عرصے سے اس کمرے کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ رہا ہوں۔ آخر بتاؤ تو سہی یہ تمہارا کوئی نیا فلسفہ ہے؟

"تم جانتے نہیں ہو، میں انقلاب پسند ہوں" سلیم نے جواب دیا۔

یُہ سنکر میں اور بھی متعجب ہُوا۔ اگر سلیم نے یہ الفاظ اپنی حسب معمول مسکراہٹ کے ساتھ کہے ہوتے تو میں یقینی طور پر یہ خیال کرتا کہ وہ صرف مذاق کر رہا ہے مگر یہ جواب دیتے وقت اس کا چہرہ اس امر کا شاہد تھا، کہ وہ سنجیدہ ہے اور میرے سوال کا جواب وہ انہی الفاظ میں دینا چاہتا ہے لیکن پھر بھی میں تذبذب کی حالت میں تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا: "مذاق کر رہے ہو یار؟"

"تمہاری قسم بہت بڑا انقلاب پسند" یہ کہتے ہوئے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

مجھے یاد ہے کہ اس کے بعد اس نے ایسی گفتگو شروع کی تھی۔ مگر ہم دونوں کسی اور موضوع پر اظہار خیالات کرنے لگ گئے تھے۔ ــــ سلیم کی عادت ہے کہ وہ بہت سی باتوں کو دلچسپ گفتگو کے پردے میں چھپا لیا کرتا ہے۔

ان دنوں جب کبھی میں سلیم کے جواب پر غور کرتا ہوں۔ تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم در حقیقت انقلاب پسند واقع ہوا ہے ــــ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی سلطنت کا تختہ الٹنے کے درپے ہے۔ یا وہ دیگر انقلاب پسندوں کی طرح چوراہوں میں بم پھینک کر دہشت پھیلانا چاہتا ہے۔ بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے۔ وہ ہر چیز میں انقلاب دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی نظریں اپنے کمرے میں پڑی ہوئی اشیاء کو ایک ہی جگہ پر نہ دیکھ سکتی تھیں۔ ممکن ہے میرا یہ قیافہ کسی حد تک غلط ہو مگر میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسکی جستجو کسی ایسے انقلاب کی طرف رجوع کرتی ہے جس کے آثار اس کے کمرے کی روزانہ تبدیلیوں سے ظاہر ہیں۔

بادی النظر میں کمرے کی اشیاء کو روز الٹ پلٹ کرتے رہنا نیم دیوانگی

کے مرادف ہے۔ لیکن اگر سلیم کی ان بے معنی حرکات کا عمیق مطالعہ کیا جائے
تو یہ امر روشن ہو جائیگا کہ اُن کے پسِ پردہ ایک ایسی قوّت کام کر رہی تھی۔
جس سے وہ خود نا آشنا تھا ـــــ اسی قوّت نے جسے میں ذہنی تعصب کا
نام دیتا ہوں سلیم کے دماغ میں تلاطم بپا کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
وہ اس طوفان کی تاب نہ لاکر از خود رفتہ ہو گیا۔ اور پاگل خانے کی چاردیواری
میں قید کر دیا گیا۔

پاگل خانے جاتے سے کچھ روز پہلے سلیم مجھے اچانک شہر کے
ایک ہوٹل میں چائے پیتا ہوا ملا۔ میں اور وہ دونوں ایک چھوٹے سے
کمرے میں بیٹھ گئے۔ اس لئے کہ میں اس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا تھا
میں نے اپنے بازار کے چند دکانداروں سے سنا تھا کہ اب سلیم ہوٹلوں
میں پاگلوں کی طرح تقریریں کرتا ہے ـــــ میں یہ چاہتا تھا کہ اس سے فوراً
مل کر اُسے اس قسم کی حرکات کرنے سے منع کر دوں۔ اسکے علاوہ یہ اندیشہ
تھا کہ شاید وہ کہیں سچ مچ مخبوط الحواس ہی نہ ہو گیا ہو۔ چونکہ میں اس سے
فوراً ہی بات کرنا چاہتا تھا۔ اسلئے میں نے ہوٹل ہی میں گفتگو کرنا مناسب
سمجھا۔

کرسی پر بیٹھتے وقت میں غور سے سلیم کے چہرے کی طرف دیکھ
رہا تھا۔ وہ مجھے اسطرح گھورتے دیکھ کر سخت متعجب ہوا۔ وہ کہنے

لگا..... "شاید میں سلیم نہیں ہوں"

آواز میں کس قدر درد تھا۔ گو یہ جملہ آپ کی نظروں میں بالکل سادہ معلوم ہو مگر خدا گواہ ہے میری آنکھیں بے اختیار نمناک ہو گئیں "شاید میں سلیم نہیں ہوں" ـــــ گویا وہ ہر وقت اس بات کا متوقع تھا کہ کسی روز اس کا بہترین دوست بھی اُسے نہ پہچان سکے گا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ وہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔

میں نے ضبط سے کام لیا۔ اور اپنے آنسوؤں کو رومال میں چھپا کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:۔

"سلیم میں نے سنا ہے کہ تم نے میرے لاہور جانے کے بعد یہاں بازاروں میں تقریریں کرنی شروع کر دی ہیں ـــــ جانتے بھی ہو، اب تمہیں شہر کا بچہ بچہ پاگل کے نام سے پکارتا ہے" ـــــ

"پاگل! شہر کا بچہ بچہ مجھے پاگل کے نام سے پکارتا ہے ـــــ پاگل! ـــــ ہاں عباس، میں پاگل ہوں ـــــ پاگل ـــــ دیوانہ ـــــ خرد باختہ ـــــ لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں ـــــ معلوم ہے کیوں؟ یہاں تک کہہ کر وہ میری طرف سراپا استفہام بن کر دیکھنے لگا۔

مگر میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ دوبارہ گویا ہوا:۔

"اس لئے کہ میں انہیں غریبوں کے ننگے بچے دکھلا دکھلا کر یہ

پوچھتا ہوں ۔ کہ اس بڑھتی ہوئی غربت کا کیا علاج ہو سکتا ہے ؟ —— وہ مجھے کوئی جواب نہیں دے سکتے ۔ اسلئے وہ مجھے پاگل تصوّر کرتے ہیں —— آہ اگر مجھے صرف یہ معلوم ہو کہ ظلمت کے اس زمانے میں روشنی کی ایک شعاع کیونکر فراہم کی جاسکتی ہے ہزاروں غریب بچوں کا تاریک مستقبل کیونکر منوّر بنایا جاسکتا ہے ۔

وُہ مجھے پاگل کہتے ہیں —— وہ جن کی نقشِ حیات دوسروں کے خون کی مرہونِ منت ہے ، وہ جن کا فردوس غرباء کے جہنّم کی مستعار اینٹوں سے استوار کیا گیا ہے ، وہ جن کے سازِ عشرت کے ہرتار کے ساتھ بیواؤں کی آہیں یتیموں کی عُریانی ، لاوارث بچوں کی صدائے گریہ لپٹی ہوئی ہے —— کہیں ، مگر ایک زمانہ آنے والا ہے جب یہی پروردہِ غربت اپنے دلوں کے نشتر کہ اُن کی انگلیاں ڈبو ڈبو کر ان لوگوں کی پیشانیوں پر اپنی لعنتیں لکھیں گے —— وہ وقت نزدیک ہے جب ارضی جنت کے دروازے ہر شخص کے لئے وا ہونگے ۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر میں آرام میں ہوں ۔ تو کیا وجہ ہے ۔ کہ تم تکلیف کی زندگی بسر کرو ؟ —— کیا یہی انسانیت ہے کہ میں کارخانے کا مالک ہوتے ہوئے ہر شب ایک نئی رقاصہ کا ناچ دیکھتا ہوں ، ہر روز کلب میں سینکڑوں روپے قمار بازی کی نذر کر دیتا ہوں ۔ اور اپنی

نکمی سے نکمی خواہش پر بیدریغ روپیہ بہا کر اپنا دل خوش کرتا ہوں، اور میرے مزدوروں کو ایک وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ اُن کے بچے مٹی کے ایک کھلونے کے لئے ترستے ہیں ——— پھر لطف یہ ہے کہ میں مہذّب ہوں، میری ہر جگہ عزّت کی جاتی ہے، اور وہ لوگ جن کا پسینہ میرے لئے گوہر تیار کرتا ہے مجلسی دائرے میں حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میں خود ان سے نفرت کرتا ہوں ——— تم ہی بتاؤ، کیا یہ دونوں ظالم و مظلوم اپنے فرائض سے ناآشنا نہیں ہیں؟

میں ان دونوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں مگر کس طرح کروں؟ ——— یہ مجھے معلوم نہیں؟

سلیم نے اس قدر کہکر ہانپتے ہوئے ٹھنڈی چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ اور میری طرف دیکھے بغیر پھر بولنا شروع کر دیا:

"میں پاگل نہیں ہوں ——— مجھے ایک وکیل سمجھو۔ بغیر کسی امید کے، جو اس چیز کی وکالت کر رہا ہے۔ جو بالکل گم ہو چکی ہے ——— میں ایک دبی ہوئی آواز ہوں ——— انسانیت ایک مُنہ ہے۔ اور میں ایک چیخ۔ میں اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر وہ میرے خیالات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے ———

میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر اسی لئے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کہ مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں اپنا پیغام کہاں سے شروع کروں ـــــ یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں اپنی آواز کے بکھرے ہوئے ٹکڑے فراہم کرتا ہوں ذہنی اذیّت کے دُھندلے غبار میں سے چند خیالات تمہید کے طور پر پیش کرنے کی سعی کرتا ہوں۔ اپنے احساسات کی عمیق گہرائیوں سے چند احساس سطح پر لاتا ہوں۔ کہ دوسرے اذہان پر منتقل کرسکوں مگر میری آواز کے ٹکڑے پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ خیالات پھر تاریکی میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ احساسات پھر غوطہ لگا جاتے ہیں ـــــ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جب میں یہ دیکھتا ہوں۔ کہ میرے خیالات منتشر ہونے کے بعد پھر جمع ہو رہے ہیں۔ تو جہاں کہیں میری قوّتِ گویائی کام دیتی ہے میں شہر کے رؤسا سے مخاطب ہو کر یہ کہنے لگ جاتا ہوں:۔

مرمریں محلّات کے مکینو! تم اس وسیع کائنات میں صرف سورج کی روشنی دیکھتے ہو مگر یقین جانو۔ اس کے سائے بھی ہوتے ہیں۔ ـــــ تم مجھے سلیم کے نام سے جانتے ہو، یہ غلطی ہے ـــــ میں وہ کپکپی ہوں۔ جو ایک کنواری لڑکی کے جسم پر طاری ہوتی ہے۔ جب وہ غربت سے تنگ آکر پہلی دفعہ ایوانِ گناہ کیطرف قدم بڑھانے لگے ـــــ

آؤ ہم سب کا نہیں !

تم ہنستے ہو یگر نہیں تمہیں مجھے ضرور سننا ہوگا ـــــ میں ایک غوطہ خور ہوں - قدرت نے مجھے تاریک سمندر کی گہرائیوں میں ڈبو دیا... ..... کہ میں کچھ ڈھونڈھ کر لاؤں ـــــ میں ایک بے بہا موتی لایا ہوں ـــــ وہ سچائی ہے ـــــ اس تلاش میں میں نے غربت دیکھی ہے ، گرسنگی برداشت کی ہے - لوگوں کی نفرت سے دو چار ہوا ہوں - جاڑے میں غریبوں کی رگوں میں خون کو منجمد ہوتے دیکھا ہے ، نوجوان لڑکیوں کو عشرت کدوں کی زینت بڑھاتے دیکھا ہے - اسلئے کہ وہ مجبور تھیں ـــــ اب میں یہی کچھ تمہارے مُنہ پر تھے کر دینا چاہتا ہوں کہ تمہیں تصویر زندگی کا تاریک پہلو نظر آ جائے -

انسانیت ایک دل ہے - ہر شخص کے پہلو میں ایک ہی قسم کا دل موجود ہے - اگر تمہارے بُوٹ غریب مزدوروں کے ننگے سینوں پر ٹھوکریں لگاتے ہیں - اگر تم اپنے شہوانی جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ کسی ہمسایہ نادار لڑکی کی عصمت دری سے ٹھنڈی کرتے ہو - اگر تمہاری غفلت سے ہزار ہا یتیم بچے گہوارۂ جہالت میں پل کر جیلوں کو آباد کرتے ہیں - اگر تمہارا دل کاجل کے مانند سیاہ ہے - تو یہ تمہارا قصور نہیں - ایوانِ معاشرت ہی کچھ ایسے ڈھب پر استوار کیا گیا ہے - کہ

اس کی ہر چھت اپنی ہمسایہ چھت کو دبے ہوئے ہے ـــــ ہر اینٹ دوسری اینٹ کو۔

جانتے ہو، موجودہ نظام کے کیا معنی ہیں؟ ـــــ یہ کہ لوگوں کے سینوں کو جہالت کدہ بنائے ۔ انسانی تعزیہ کی کشتی ہوا و ہوس کی موجوں میں بہا دے، جوان لڑکیوں کی عصمت چھین کر انہیں ایوانِ تجارت میں کھلے بندوں حسن فروشی پر مجبور کر دے ۔ غریبوں کا خون چوس کر انہیں جلی ہوئی راکھ کے مانند قبر کی مٹی میں یکساں کر دے ـــــ کیا اسی کو تم تہذیب کا نام دیتے ہو ـــــ بھیانک قصابی!! تاریک شیطنیت ـــــ!!!

آہ اگر تم صرف وہ دیکھ سکو۔ جس کا میں نے مشاہدہ کیا ہے!۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں۔ جو قبر نما جھونپڑوں میں زندگی کے سانس پورے کر رہے ہیں۔ تمہاری نظروں کے سامنے ایسے افراد موجود ہیں۔ جو موت کے منہ میں جی رہے ہیں ۔ ایسی لڑکیاں ہیں۔ جو بارہ سال کی عمر میں عصمت فروشی شروع کرتی ہیں ۔ اور بیس سال کی عمر میں قبر کی سردی سے لپٹ جاتی ہیں ـــــ مگر تم ـــــ ہاں تم، جو اپنے لباس کی تراش کے متعلق گھنٹوں غور کرتے رہتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے ۔ بلکہ اُلٹا غریبوں سے چھین کر امراء کی دولتوں میں اضافہ

کرتے ہو۔ مزدور سے لے کر کاہل کے حوالے کر دیتے ہو۔ گودڑی پہنے انسان کا لباس اتار کر حریر پوش کے سپرد کر دیتے ہو۔

تم غرباء کے غیر مختتم مصائب پر ہنستے ہو۔ مگر تمہیں یہ معلوم نہیں۔ کہ اگر درخت کا نچلا حصہ لاغر و مردہ ہو رہا ہے تو کسی روز وُہ بالائی حصّے کے بوجھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے گر پڑے گا!"

یہاں تک بول کر سلیم خاموش ہو گیا اور ٹھنڈی چائے کو آہستہ آہستہ پینے لگا۔

تقریر کے دوران میں میں سحر زدہ آدمی کی طرح چپ چاپ بیٹھا اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ جو بارش کی طرح برس رہے تھے۔ بغور سُنتا رہا۔ میں سخت حیران تھا۔ کہ وہ سلیم جو آج سے کچھ عرصہ پہلے بالکل خاموش ہوا کرتا تھا۔ اتنی طویل تقریر کیونکر جاری رکھ سکا ہے۔ اس کے علاوہ خیالات کس قدر حق پر مبنی تھے۔ اور آواز میں کتنا اثر تھا۔ ـــــ میں ابھی اسکی تقریر کے متعلق کچھ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ وہ پھر بولا:۔

"خاندان کے خاندان شہر کے یہ ننگ نگل جاتے ہیں۔ عوام کے اخلاق قرانین سے مسخ کئے جاتے ہیں۔ لوگوں کے زخم جرمانوں سے کریدے جاتے ہیں ٹیکسوں کے ذریعے دامن غربت کترا جاتا ہے۔ تباہ شدہ ہیئت

جہالت کی تاریکی سیاہ بنادیتی ہے ___ ہر طرف حالتِ نزع کے سانس کی لرزاں آوازیں، عریانی، گناہ، اور فریب ہے۔ مگر دعوے یہ ہے کہ عوام امن کی زندگی بسر کر رہے ہیں ___ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی جا رہی ہے۔ ہمارے کانوں سے پگھلا ہُوا سیسہ اتارا جا رہا ہے۔ ہمارے جسم مصائب کے کوڑے سے بے حس بنائے جا رہے ہیں۔ کہ ہم نہ دیکھ سکیں۔ نہ سُن سکیں اور نہ محسوس کر سکیں! ___ انسان جنہیں بلندیوں پر پرواز کرنا تھا۔ کیا ان کے بال و پر نوچ کر اُسے زمین پر رینگنے کے لئے مجبور نہیں کیا جا رہا؟ ___ کیا امراء کی نظر فریب عمارتیں مزدوروں کے گوشت پوست سے تیار نہیں کی جاتیں؟ ___ کیا عوام کے مکتوبِ حیات پر جرائم کی مہر ثبت نہیں کی جاتی؟ کیا مفلسی بدن کی رگوں میں بدی کا خون موجزن نہیں ہے؟ کیا جمہور کی زندگی کشمکش پیہم اُن تھک محنت اور قوت برداشت کا مرکب نہیں ہے؟ ___ بتاؤ بتاؤ، بتاتے کیوں نہیں؟

"درست ہے" میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تو پھر اس کا علاج کرنا تمہارا فرض ہے ___ کیا تم کوئی طریقہ نہیں بتا سکتے۔ کہ اس انسانی تذلیل کو کیونکر روکا جا سکتا ہے ___ مگر آہ! تمہیں معلوم نہیں، مجھے خود معلوم نہیں"!!

تھوڑی دیر کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر رازدارانہ لہجے میں یوں کہنے لگا:۔
"عباس! عوام سخت تکلیف برداشت کر رہے ہیں بعض اوقات جب کبھی میں کسی سوختہ حال انسان کے سینے سے آہ بلند ہوتے دیکھتا ہوں۔ تو مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں شہر نہ جل جائے! ـــــ اچھا اب میں جاتا ہوں، تم لاہور واپس کب جا رہے ہو؟"
"یہ کہکر وہ اُٹھا۔ اور ٹوپی سنبھال کر باہر چلنے لگا۔
"ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں ـــــ کہاں جاؤ گے آپ؟"
اسے یک لخت کہیں جانے کے لئے تیار دیکھکر میں نے اُسے فوراً ہی کہا۔
"مگر میں اکیلا جانا چاہتا ہوں ـــــ کسی باغ میں جاؤں گا!"
میں خاموش ہو گیا۔ اور وہ ہوٹل سے نکل کر بازار کے ہجوم میں گم ہو گیا
اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے لاہور میں اطلاع ملی کہ سلیم نے میرے جانے کے بعد بازاروں میں دیوانہ وار تقریریں کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے اُسے پاگل خانے میں داخل کر لیا گیا ہے۔

(۲۴۔ مارچ سنہ ۳۵ء)

اشاعت اولیں:۔
"علیگڑھ میگزین"

جی آیا صاحب

باورچی خانے کی دھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قمقمہ چراغ گور کی مانند اپنی سرخ روشنی پھیلا رہا تھا۔ دھوئیں سے اٹی ہوئی دیواریں ہیبتناک دیووں کی طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ چبوترے پر بنی ہوئی انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں ابھر ابھر کر اپنی موت کا ماتم کر رہی تھیں ایک برقی چولھے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی نہ معلوم کس چیز پر خاموش ہنسی ہنس رہا تھا ـــــ دور کونے میں۔ پانی کے نل کے پاس ایک چھوٹی عمر کا لڑکا بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا ـــــ یہ انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے

تھے۔ جو اس کی زباں سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔
"جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! ــــــ بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب"،

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد اُنہیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا۔ اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں پر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کئے بغیر آرام ــــــ یہ کیونکر ممکن تھا؟

برتی چولھا پستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اگل رہا تھا۔ کیتلی کا پانی اسی انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے نا قابل مغلوب حملے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے جسم کو ایک جنبش دی۔ اور "جی آیا صاحب، جی آیا صاحب" گنگناتا ہؤا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دیوار گیروں پر چمکتے ہوئے برتن اس لڑکے کو ایک غیر مختتم ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ پانی کے نل سے روزانہ ایک ہی واقعہ دیکھ کر قطروں کی صورت میں آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بجلی کا قمقمہ حیرت سے اُس لڑکے کی طرف ــ دیکھ رہا تھا ــــــ کمرے کی فضا سسکیاں بھرتی ہوئی معلوم ہو رہی ــ تھی۔

" قاسم ـــــ قاسم "

" جی آیا صاحب " لڑکا جو انہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا - بھاگا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا -

انسپکٹر صاحب نے کمبل سے منہ نکالا - اور لڑکے پر خفا ہوتے ہوئے کہا " بیوقوف کے بچے ! آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے -

" ابھی لایا صاحب ـــــ ابھی لایا صاحب "

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کیلئے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اُس کمرے سے آواز آئی :-

" قاسم ــــ قاسم "

" جی آیا صاحب " قاسم بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا -

" بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے ـــــ جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لیکر آؤ - بس بھاگتے ہوئے جاؤ ـــــ سخت پیاس لگ رہی ہے "

" بہت اچھا صاحب "

قاسم بھاگتا ہوا گیا - اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا - سوڈے کی بوتل لے آیا - اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دیدی -

" اب تم جاؤ - مگر اسوقت تک کیا کر رہے ہو - برتن صرف نہیں

ہوئے کیا؟

"ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب"

اور ہاں برتن صاف کرنے کے بعد میرے سیاہ بوٹ کو پالش کر دینا مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے۔ ورنہ ــــــ"

قاسم کو "ورنہ" کے بعد کا جملہ بخوبی معلوم تھا "بہت اچھا صاحب"۔ کہتے ہوئے وہ باورچی خانے میں واپس چلا گیا۔ اور برتن صاف کرنے شروع کر دیے۔

اب نیند اُسکی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی۔ پلکیں آپس میں مل جا رہی تھیں۔ سر میں سیسہ اُتر رہا تھا ــــــ یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں۔ قاسم نے اپنے سر کو زور سے جُنبش دی۔ اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

"جی آیا صاحب، جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب"

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رُکا۔ اب اُسے محسوس ہونے لگا۔ کہ نیند ضرور غلبہ پا کر رہے گی۔ لیکن ابھی برتنوں کو دھو کر اُنہیں اپنی اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا۔ اسوقت ایک عجیب خیال اسکے دماغ میں آیا "بھاڑ میں جائیں برتن۔ اور چولھے میں جائیں بوٹ۔ کیوں نہ

تھوڑی دیر اسی جگہ پر سو جاؤں - اور پھر چند لمحات آرام کرنے کے بعد ---"

اس خیال کو باغیانہ تصور کرتے ہوئے قاسم نے ترک کر دیا - اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی -

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی - تو اس کے جی میں آیا کہ اُبلتا ہُوا پانی اپنے سر پر انڈیل لے - اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی - نجات پا جائے ____ مگر اتنا حوصلہ نہ پڑا -

بعد مشکل مُنہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اُس نے سب برتنوں کو بالآخر صاف کر ہی لیا - یہ کام کرنے کے بعد اُس نے اطمینان کا سانس لیا - اب وہ آرام سے سو سکتا تھا - اور نیند ____ وہ نیند جس کے لئے اُسکی آنکھیں اور دماغ اس شدّت سے انتظار کر رہے تھے - اب بالکل نزدیک تھی -

باورچی خانے کی روشنی گُل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھایا - اور لیٹ گیا - اور اس سے پہلے کہ نیند اُسے اپنے آرام دہ بازوؤں میں تھام لے - اس کے کان "لوٹ، لوٹ" کی آوازوں سے گونج اُٹھے -

" بہت اچھا صاحب ـــــ ابھی پالش کرتا ہوں " بڑبڑاتا ہوا قاسم بستر پر سے اُٹھا۔ جیسے اُس کے آقا نے ابھی بوٹ روغن کرنے کیلئے حکم دیا ہے۔

ابھی قاسم بوٹ کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا۔ کہ نیند کے غلبے نے اُسے وہیں پر سُلا دیا۔

سورج کی خونیں کرنیں اس مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں۔ ـــــ قاسم کی کتابِ حیات میں ایک اور پُراز مشقّت باب کا اضافہ ہوگیا۔

صبح جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر باہر برآمدے میں بوٹوں کے پاس سویا ہوا دیکھا۔ تو اُسے ٹھوکر مار کر جگاتے ہوئے کہا " یہ سؤر کی طرح یہاں بیہوش پڑا ہے۔ اور مجھے خیال تھا۔ کہ اس نے بُوٹ صاف کر لئے ہونگے ـــــ نمک حرام! ـــــ اے قاسم!"

" جی آیا صاحب "

" قاسم کے مُنہ سے اتنا ہی نکلا تھا۔ کہ اُس نے اپنے ہاتھ میں بوٹ صاف کرنے کا بُرش دیکھا۔ فوراً ہی اس معاملے کو سمجھتے ہوئے اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:۔

" میں سو گیا تھا صاحب! مگر ـــــ مگر بوٹ ابھی پالش ہو جاتے

ہیں صاحب ۔۔"
یہ کہتے ہوئے اُس نے جلدی جلدی بوٹ کو برش سے رگڑنا شروع کر دیا۔
بُوٹ پالش کرنے کے بعد اُس نے اپنا بستر تہ کیا۔ اور اُسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔
" قاسم "
"جی آیا صاحب"
" قاسم بھاگا ہُوا نیچے آیا۔ اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔
" دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئینگے۔ اس لئے باورچی خانے کے تمام برتن اچھی طرح صاف کر رکھنا ۔۔۔ فرش بھی دُھلا ہُوا ہونا چاہیئے، اس کے علاوہ تمہیں ملاقاتی کمرے کی تصویروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی صاف کرنا ہوگا ۔۔۔ سمجھے! مگر خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھاگا چاقو پڑا ہُوا ہے، اسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جارہا ہوں۔ مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے ہو جانا چاہیئے"
" بہت بہتر صاحب "
انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اُس نے باورچی خانے کے تمام کام کو ختم کر دیا۔ اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ملاقاتی کمرے میں چلا گیا۔

وُہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا۔ کہ اُس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ اس کے گردو پیش برتن ہی برتن پڑے ہیں۔ اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے۔ ہوا زوروں پر چل رہی ہے جس سے وُہ راکھ اُڑا اُڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے۔ یکایک اس ظلمت میں ایک سُرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں خون آشام برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھُس گئیں۔ زمین خون سے تر الود ہو گئی ــــــ فضا خوشی کے قہقہوں سے معمور ہو گئی۔

قاسم یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور اس وحشتناک خواب سے بیدار ہو کر "جی آیا صاحب، جی آیا صاحب" کہتا ہُوا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُسکی آنکھوں کے سامنے ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ اب اُس کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ دفعتاً آندھی چلنی شروع ہوئی جس کے ساتھ ہی

ایک بدنما اور بھیانک دیونمودار ہُوا۔ جوان سب لڑکوں کو نگل گیا۔
——— قاسم نے خیال کیا۔ کہ دہ دیو اس کے آقا کے ہم شکل تھا۔ گو قدوقامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا ——— قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا۔ اور وقت بہت کم رہ گیا تھا چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کر دیا۔ ابھی وُہ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد میز صاف کرنے جارہا تھا۔ کہ اُسے یکایک خیال آیا "آج مہمان آرہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنے پڑینگے۔ اور یہ نیند کمبخت کتنی ستا رہی ہے ——— مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا ———"

یہ سوچتے وقت وہ میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا کہ اچانک اُسے تلدان کے پاس ایک کھُلا ہُوا چاقو نظر آیا ——— وہی چاقو جس کے متعلق اُس کے آقا نے کہا تھا۔ کہ بہت تیز ہے۔

چاقو کا دیکھنا تھا کہ اُس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے ——— چاقو ——— تیز دھار چاقو! ——— یہی تمہاری مصیبت کو ختم کرسکتا ہے"۔
کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اُٹھا اپنی انگلی پر پھیر

لیا ـــ اب وُہ شام کے وقت برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دُور تھا ۔ اور نیند ـــ پیاری، پیاری نیند اب اُسے بآسانی نصیب ہوسکتی تھی ۔

اُنگلی سے خون کی سُرخ دھار بہہ رہی تھی ـــ سامنے والی دھات کی سُرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی ۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسّرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ۔ اور مُنہ میں یہ گنگنا رہا تھا "نیند، نیند ـــ پیاری نیند "

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگا ہوُا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنانخانے میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی ۔ اور اپنی زخمی اُنگلی دکھا کر کہنے لگا ـــ " دیکھئے بی بی جی ـــ "

" ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا ؟ ـــ کمبخت صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہوگا تو نے "؟

" بی بی جی ـــ بس میز صاف کر رہا تھا ۔ اور اس نے کاٹ کھایا "

قاسم ہنس پڑا ۔

" ابے سوُر اب ہنستا ہے ، ادھر آ ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں ، ـــ مگر اب بتا تو سہی ، آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا "؟

قاسم اپنی فتح پر زیرِ لب مُسکرا رہا تھا ۔

انگلی پر پٹی بندھواکر قاسم پھر کمرے میں آگیا۔ اور میز پر پڑے ہوئے خون کے دھبّوں کو صاف کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔

"اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہونگے، ــــ ضرور صاف کرنے ہونگے ــــ کیوں میاں مٹھو ؟ قاسم نے انتہائی مسرّت میں کھڑکی میں لٹکے ہوئے طوطے سے دریافت کیا۔

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانے میں صاف کرنے والے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا ــــ انسپکٹر صاحب قاسم کی زخمی اُنگلی دیکھکر بہت برسے۔ اور جی کھول کر گالیاں دیں۔ مگر اُسے مجبور نہ کرسکے ــــ شاید اس لئے کہ ایک بار اُن کی اپنی اُنگلی میں قلمتراش کی نوک چُبھ جانے سے بہت درد محسوس ہوا تھا۔ آقا کی خفگی آنے والی مسرّت نے بُھلادی۔ اور قاسم کو دنا پھاندتا ہوا اپنے بستر میں جالیٹا تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا۔ مگر اُس کے بعد اُنگلی کا زخم بھر آیا ــــ اب پھر وہی مصیبت نمودار ہوگئی۔

قاسم ــــ صاحب کی جرابیں اور قمیص دھوڈالو"

"بہت اچھا بی بی جی"

"قاسم اس کمرے کا فرش کتنا بدنما ہو رہا ہے۔ پانی لاکر ابھی صاف کرو۔۔۔ دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے۔۔۔"

"بہت اچھا صاحب"

"قاسم شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں۔ انہیں نمک سے صاف کرو"

"جی اچھا صاحب"

"قاسم طوطے کا پنجرہ کس قدر غلیظ ہو رہا ہے۔ اسے صاف کیوں نہیں کرتے؟"

ابھی کرتا ہوں بی بی جی۔

"قاسم! ابھی خاکروب آتا ہے۔ تم پانی ڈالتے جانا۔ وہ سیڑھیوں کو دھوڈالے گا"

"بہت اچھا صاحب۔"

"قاسم! ذرا بھاگ کے ایک آنے کا دہی تو لے آنا"

"ابھی چلا بی بی جی"

پانچ چھ روز اسی قسم کے احکام سنتے ہیں گذر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آگیا۔ ہر روز اُسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا۔ اور پھر علی الصباح چار بجے کے قریب بیدار

ہو کر ناشتے کے لئے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لئے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اُس کے ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھے۔ اور ایک لمحے کے بعد اس کی اُنگلی سے خون بہہ رہا تھا ـــــ انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی یہ حرکت دیکھکر بہت خفا ہوئے۔ چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا۔ مگر وہ اپنی ایجاد ترکیب کی خوشی میں مگن تھا۔ ـــــ ایک وقت روٹی نہ ملی۔ انگلی پر معمولی سا زخم آ گیا مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے نجات مل گئی ـــــ یہ سودا کچھ برا نہ تھا۔

چند دنوں کے بعد اُس کی اُنگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب پھر کام کی وہی بھرمار شروع تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گذر گئے۔ اس عرصے میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا۔ کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کرے۔ مگر اب میز پر سے وہ چاقو اُٹھا لیا گیا۔ اور باورچی خانے والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب اُسے ہر وقت باورچی خانے میں موجود رہنا پڑتا۔ کبھی مرچیں پیستا۔ کبھی آٹا گوندھتا کبھی کوئلوں کو جلا دینا۔ غرض صبح سے لیکر آدھی رات تک اُسکے کانوں میں "آیے

قاسم یہ کر، ابے قاسم وہ کر" کی صدا گونجتی رہتی۔
باورچی دو روز تک نہ آیا ــــ قاسم کی ننھی جان اور ہمت جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا؟
ایک روز اس کے آقا نے اُسے الماری صاف کرنے کو کہا۔ جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اُسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ کو پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز اور باریک، اُنگلی میں دُور تک چلی گئی جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔
قاسم نے بہت کوشش کی۔ کہ خون نکلنا بند ہو جائے مگر زخم کا منہ بڑا تھا۔ وہ نہ تھما ــــ سیروں خون پانی کی طرح بہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا۔ بھاگا ہُوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔
"بی بی جی، میری انگلی میں صاحب کا اُسترا لگ گیا ہے"۔
جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا۔ فوراً معاملے کو سمجھ گئی چُپ چاپ اُٹھی اور کپڑا نکال کر اُس کی اُنگلی پر باندھ دیا۔ اور کہا "قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے"۔

"وہ کیوں بی بی جی؟"

"یہ صاحب سے دریافت کرنا"۔

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور بھی سپید ہو گیا۔
چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے گھر آئے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سُنکر اُسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

"کیوں میاں یہ انگلی کو ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی ہیں؟"

قاسم خاموش کھڑا رہا۔

"تم نوکر یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ اندھے ہیں۔ اور ہمیں بار بار دھوکہ دیا جا سکتا ہے ـــــ اپنا بستر بوریہ دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہمیں تم جیسے نوکروں کی کوئی ضرورت نہیں ـــــ سمجھے؟"

"مگر ـــــ مگر صاحب"۔

"صاحب کا بچّہ ـــــ بھاگ جا یہاں سے، تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائیگا ـــــ اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا ـــــ"

قاسم روتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ طوطے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ طوطے نے بھی خاموشی میں اس سے کچھ کہا اور

اپنا بسترہ لے کر وُہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ مگر دفعتاً کچھ خیال آیا۔ اور بھاگا ہُوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔ اور دردانگیز آواز میں اتنا کہکر "سلام بی بی جی ــــــ میں ہمیشہ کے لئے آپ سے رخصت ہو رہا ہوں"۔ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدت سے لوہے کے پلنگ پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ پاس ہی دو ڈاکٹر بیٹھے ہیں۔ اُن میں سے ایک ڈاکٹر اپنے ساتھی سے مخاطب ہُوا "زخم خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے ــــــ ہاتھ کاٹنا پڑے گا"

"بہت بہتر"

یہ کہتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر نے اپنی نوٹ بک میں اُس مریض کا نام درج کر لیا ــــــ ایک چوبی تختے پر جو چارپائی کے سرہانے لٹکا ہُوا تھا۔ مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے ۔

نام:۔ محمد قاسم ولد عبدالرحمٰن (مرحوم)

عمر:۔ دس سال ۔

ماھی گیر

[فرانسیسی شاعر وکٹر ہیوگو کی ایک نظم کے تاثرات]

سمندر رو رہا تھا :

مقیّد لہریں پتھریلے ساحل کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر آہ و زاری کر رہی تھیں۔
دُور ——— پانی کی رقصاں سطح پر چند کشتیاں اپنے دُھندلے اور کمزور
بادبانوں کے سہارے بے پناہ سردی سے ٹھٹھری ہوئی کانپ رہی تھیں
آسمان کی نیلی قبا میں چاند کِھل کِھلا کر ہنس رہا تھا۔ ستاروں کا کھیت
اپنے پورے جوبن میں لہلہا رہا تھا ——— فضا سمندر کے نمکین پانی
کی تیز بُو میں بسی ہوئی تھی۔
ساحل سے کچھ فاصلے پر چند شکستہ جھونپڑیاں خاموش زبان

میں ایک دوسرے سے اپنی خستہ حالی کا تذکرہ کر رہی تھیں ـــــــ یہ ماہی گیروں کے سر چھپانے کی جگہیں تھیں۔

ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا جس میں چاند کی آوارہ شعاعیں زمین پر رینگ رینگ کر اسکی کا جل ایسی فضا کو نیم روشن کر رہی تھیں۔ اس اندھی روشنی میں دیوار پر ماہی گیر کا جال نظر آرہا تھا۔ اور ایک چوبی تختے پر چند تھالیاں جھلملا رہی تھیں۔

جھونپڑی کے کونے میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی، تاریک چادروں میں ملبوس اندھیرے میں سر نکالے ہوئے تھی۔ اس کے پہلو میں پھٹے ہوئے ٹاٹ پر پانچ بچے محوِ خواب تھے ـــــــ ننھی روحوں کا ایک گھونسلا جو خوابوں سے تھر تھرا رہا تھا۔ پاس ہی ان کی ماں نہ معلوم کن خیالات میں مستغرق گھٹنوں کے بل بیٹھی گنگنا رہی تھی۔

یکایک وہ لہروں کا شور سن کر چونکی ـــــــ بوڑھا سمندر کسی آنیوالے خطرے سے آگاہ، سیاہ چٹانوں، تندہواؤں اور نصف شب کی تاریکی کو مخاطب کر کے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہا تھا۔ وہ اُٹھی اور بچّوں کے پاس جا کر ہر ایک کی پیشانی پر اپنے سرد لبوں سے بوسہ دیا۔ اور وہیں ٹاٹ کے ایک کونے میں بیٹھ کر دعا مانگنے لگی۔ لہروں کے شور میں یہ الفاظ بخوبی سنائی دے رہے تھے:۔

"لے خدا! ـــــ اے بیکسوں اور غریبوں کے خدا، ان بچّوں کا واحد سہارا، رات کا تاریک کفن اوڑھے سمندر کی لہروں کے ساتھ کھیل رہا ہے ـــــ موت کے عمیق گڑھے پر پاؤں لٹکائے ہے ـــــ صرف ان کی خاطر وہ ہر روز اس دیو کے ساتھ کشتی لڑتا ہے ـــ اے خدا! تو اسکی جان حفاظت میں رکھیو ـــــ آہ! اگر یہ صرف نوجوان ہوتے، اگر یہ صرف اپنے والد کی مدد کر سکتے!!"

یہ کہکر خدا معلوم اُسے کیا خیال آیا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ گئی - اور ٹھنڈی آہ بھر کر تھراتی ہوئی آواز میں کہنے لگی "بڑے ہو کر ان کا بھی یہی شغل ہوگا۔ پھر مجھے چھ جانوں کا خدشہ لاحق رہے گا ـــــ آہ، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، غربت! غربت!!"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی غربت اور تنگ دامانی کے خیالات میں غرق ہو گئی - دفعتاً وہ اس اندھیرے خواب سے بیدار ہوئی - اور اُس کے دماغ میں ہوٹلوں کی دیو قامت عمارتیں اور امراء کے راحت کدوں کی تصویریں کھچ گئیں - ان عمارتوں کی دلفریب راحتوں اور امراء کی تعیش پرستیوں کا خیال آتے ہی اُس کے دل پر ایک دُھندسی چھا گئی ـــ کلیجے پر کسی غیر مرئی ہاتھ کی گرفت محسوس کر کے وہ جلدی سے اُٹھی - اور دروازے سے تاریکی میں آوارہ نظروں سے دیکھنا شروع کیا -

اُسکی یہ حرکت خیالات کی آمد کو نہ روک سکی۔ وہ سخت حیران تھی۔
کہ لوگ امیر اور غریب کیوں ہوتے ہیں۔ جبکہ ہر انسان ایک ہی طرح
ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کے حل کے لئے
اس نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا۔ مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل
سکا۔ ایک اور چیز جو اُسے پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ جب اُس کا
خاوند اپنی جان پر کھیل کر سمندر کی گود سے مچھلیاں چھین کر لاتا ہے
تو کیا وجہ ہے کہ مارکیٹ کا مالک بغیر محنت کئے ہر روز سینکڑوں
روپے پیدا کر لیتا ہے۔ اُسے یہ بات خاص طور پر عجیب سی معلوم ہوئی
کہ محنت تو کریں ماہی گیر اور نفع ہو مارکیٹ کے مالک کو۔ رات بھر اُس
کا خاوند اپنا خون پسینہ ایک کر دے۔ اور صبح کے وقت آدھی کمائی
اُس کی بڑی توند میں چلی جائے ـــــ ان تمام سوالوں کا کچھ جواب نہ
پا کر وہ ہنس پڑی۔ اور بلند آواز میں کہنے لگی:۔

"مجھ کم عقل کو بھلا کیا معلوم ہو۔ یہ سب کچھ خدا جانتا ہے۔ مگر ـــــ"

اس کے بعد وہ کچھ کہنے والی تھی۔ کہ کانپ اُٹھی "اے خدا،
میں گنہگار ہوں۔ تو جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے ـــــ ایسا خیال کرنا
کفر ہے"

یہ کہتی ہوئی وہ خاموشی سے اپنے بچوں کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اُن کے معصوم چہروں کی طرف دیکھکر بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ باہر آسمان پر کالے بادل مہیب ڈائنوں کی صورت میں اپنے سیاہ بال پریشان کئے چکر کاٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی اگر کوئی بادل کا ٹکڑا چاند کے درخشاں رُخسار پر اپنی سیاہی مل دیتا۔ تو فضا پر قبر کی تاریکی چھا جاتی سمندر کی سیمیں لہریں گہرے رنگ کی چادر اوڑھ لیتیں۔ اور کشتیوں کے مستولوں پر ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں اس اچانک تبدیلی کو دیکھکر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیتیں۔

ماہی گیر کی بیوی نے اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کئے اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ کہ آیا دن طلوع ہوا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس کا خاوند طلوع کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گھر واپس آجایا کرتا تھا مگر صبح کا ایک سانس بھی بیدار نہ ہوا تھا۔ سمندر کی تاریک سطح پر روشنی کی ایک دھاری بھی نظر نہ آرہی تھی۔ بارش کا جل کیطرح تمام فضا پر برس رہی تھی۔

وہ بہت دیر تک دروازے کے پاس کھڑی اپنے خاوند کے خیال میں مستغرق رہی۔ جو اس بارش میں سمندر کی تند موجوں کے مقابلے میں لکڑی کے ایک معمولی تختے اور کمزور بادبان سے مسلح تھا۔ وہ ابھی

اسلی عافیت کے لئے دُعا مانگ رہی تھی کہ یکایک اس کی نگاہیں اندھیر میں ایک شکستہ جھونپڑی کی طرف اُٹھیں۔ جو تاروں سے محروم آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے لرز رہی تھی۔

اس جھونپڑی میں روشنی کا نام تک نہ تھا۔ کمزور دروازہ کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ تنکوں کی چھت ہوا کے دباؤ تلے دوہری ہو رہی تھی۔

"آہ! خدا معلوم بیچاری بیوہ کا کیا حال ہے ___ اُسے کئی روز سے بخار آ رہا ہے" ماہی گیر کی بیوی زیر لب گنگنائی۔ اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید کسی روز وُہ بھی اپنے خاوند سے محروم ہو جائے ___ کانپ اُٹھی۔

وہ شکستہ جھونپڑی ایک بیوہ کی تھی۔ جو اپنے دو کم سن بچوں سمیت روٹی کے قحط میں موت کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی مصیبت کی چلچلتی ہوئی دھوپ میں اُس پر کوئی سایہ کرنے والا نہ تھا۔ رہا سہا سہارا دو ننھے بچّے تھے۔ جو ابھی مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔

ماہی گیر کی بیوی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ اُمڈا۔ بارش سے بچاؤ کے لئے سر پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا رکھ کر اور ایک اندھی لالٹین روشن کرتے کے بعد وُہ جھونپڑی کے پاس پہنچی۔ اور دھڑکتے ہوئے

دل سے دروازے پر دستک دی ــــ لہروں کا شور، اور تیز ہواؤں کی چیخ پُکار اس دستک کا جواب تھے وُہ کانپی اور خیال کیا کہ شاید اس کی اچھی ہمسایہ گہری نیند سو رہی ہے ۔

اس نے ایک بار پھر آواز دی ، دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر جواب پھر خاموشی تھا ــــ کوئی صدا، کوئی جواب اس جھونپڑی کے بوسیدہ لبوں سے نمودار نہ ہُوا۔ یکایک دروازہ، جیسے اس بے جان چیز نے رحم کی لہر محسوس کی متحرک ہُوا۔ اور کُھل گیا۔

ماہی گیر کی بیوی جھونپڑی کے اندر داخل ہوئی۔ اور اس خاموش قبر کو اپنی اندھی لالٹین سے روشن کر دیا جس میں لہروں کے شور کے سوا مکمل سکوت طاری تھا۔ پتلی چھت سے بارش کے قطرے بڑے بڑے آنسوؤں کی صورت میں سیاہ زمین کو تر کر رہے تھے ــــ فضا میں ایک مہیب خوف سانس لے رہا تھا۔

ماہی گیر کی بیوی اُس خوفناک سماں کو دیکھ کر جو جھونپڑی میں سمٹا ہُوا تھا۔ سر تا پا ارتعاش بن کر رہ گئی۔ آنکھوں میں گرم گرم آنسو چھلکے۔ اور بے اختیار اُچھل کر بارش کے ٹپکے ہوئے قطروں کے ساتھ ہم آغوش ہو گئے۔ اُس نے ایک سرد آہ بھری اور دردناک آواز میں کہنے لگی:۔

"آہ! ــــ ترانِ بوسوں کا جو جسم کو راحت بخشتے ہیں۔ ماں کی محبت، گیت، تبسم، ہنسی، اور ناچ کا ایک ہی انجام ہے ــــ یعنی قبر! ــــ آہ میرے خدا!!"

اُس کے سامنے پھُوس کے بستر پر بیوہ کی سرد لاش اکڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے پہلو میں دو بچّے محوِ خواب تھے۔ لاش کے سینے میں ایک آہ کچھ کسنے کو رُکی ہوئی تھی۔ اسکی پتھرائی ہوئی آنکھیں جھونپڑی کی خستہ چھت کو چیر کر تاریک آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اُنہیں کچھ پیغام دینا ہے۔

ماہی گیر کی بیوی اس وحشت خیز منظر کو دیکھ کر چلا اٹھی۔ تھوڑی دیر دیوانہ وار ادھر اُدھر گھومی۔ یکایک اُسکی نمناک آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ اور اُس نے لپک کر لاش کے پہلو سے کچھ چیز اُٹھا کر اپنی چادر میں لپیٹ لی۔ اور اس ذار الخطر سے لڑکھڑاتی ہوئی اپنی جھونپڑی میں چلی آئی۔

چہرے کے بدلے ہوئے رنگ اور لرزاں ہاتھوں سے اس نے اپنی جھولی کو میلے بستر پر خالی کر دیا۔ اور اس پر پھٹی ہوئی چادر ڈال دی۔ تھوڑی دیر بیوہ سے چھینی ہوئی چیز کی طرف دیکھ کر وہ اپنے بچوں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔

سطحِ سمندر کے اُفق پر سپیدہ ہو رہا تھا۔ سورج کی دُھندلی شعاعیں تاریکی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ماہی گیر کی بیوی بیٹھی اپنے احساسِ جُرم کے شکستہ تار چھیڑ رہی تھی۔ ان غیر مربوط الفاظ کے ساتھ کن سُری لہریں اپنی مغموم تانیں چھیڑ رہی تھیں۔

"آہ! میں نے بہت بُرا کیا ہے! اب اگر وہ مجھے مارے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی ـــــ یہ بھی عجیب ہے کہ میں اُس سے خائف ہوں جس سے محبت کرتی ہوں ـــــ کیا واپس چھوڑ آؤں ـــــ نہیں ـــــ شاید وُہ مجھے معاف کر دے!"

وہ اسی قسم کے خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھی ہوئی تھی کہ ہوا کے زور سے دروازہ ہلا۔ یہ دیکھ کر اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اُٹھی۔ اور کسی کو نہ پا کر وہیں متفکر بیٹھ گئی۔

"ابھی نہیں ـــــ بیچارہ ـــــ اُسے ان بچّوں کے لئے کتنی تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے۔ اکیلے آدمی کو سات پیٹ پالنے پڑتے ہیں ..... مگر یہ شور کیا ہے"؟

یہ آواز چیختی ہوئی ہوا کی تھی ـ جو جھونپڑی کے ساتھ رگڑ کر گذر رہی تھی۔

"اُسکے قدموں کی چاپ! ـــــ آہ! نہیں ہوا ہے" یہ کہہ کر

وُہ پھر اپنے اندرونی غم میں ڈوب گئی۔ اب اُس کے کانوں میں ہواؤں اور لہروں کا شور مفقود ہوگیا ـــــ سینے میں خیالات کا تصادم کیا کم شور تھا۔

آبی جانور ساحل کے آس پاس چلّا رہے تھے۔ پانی میں گھِسے ہوئے سنگریزے ایک دوسرے سے ٹکرا کر کھنکنا رہے تھے۔ کشتی کے چپوؤں کی آواز صبح کی خاموش فضا کو مرتعش کر رہی تھی، ـــــ ماہی گیر کی بیوی کشتی کی آمد سے بے خبر اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

دفعتاً دروازہ ایک شور کے ساتھ کھُلا ـــــ صُبح کی دُھندلی شعاعیں جھونپڑی میں تیرتی ہوئی داخل ہوئیں۔ ساتھ ہی ماہی گیر کاندھوں پر ایک بڑا سا جال ڈالے دہلیز پر نمودار ہوُا۔

اُس کے کپڑے رات کی بارش اور سمندر کے نمکین پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، جسم سردی اور غیر معمولی مشقت سے اکڑا ہوُا تھا۔

"نسیم کے ابّا، تم ہو!" ماہی گیر کی بیوی چونک اُٹھی۔ اور عاشقانہ بیتابی سے اپنے خاوند کو چھاتی سے لگا لیا۔

"ہاں، میں ہوں پیاری!"

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر کے کشادہ مگر مغموم چہرے پر مسرّت کی ایک دُھندلی روشنی چھاگئی، وہ مُسکرایا ــــ بیوی کی محبّت نے اس کے دل سے رات کی کُلفت کا خیال محو کر دیا۔

"موسم کیسا تھا؟" بیوی نے محبّت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"تُند!"

"مچھلیاں ہاتھ آئیں؟"

"بہت کم ــــ آج رات تو سمندر قزاقوں کے گروہ کے مانند تھا۔"

یہ سُن کر اسکی بیوی کے چہرے پر مُردنی چھاگئی - ماہی گیر نے اُسے مغموم دیکھا - اور مُسکرا کر بولا -

"تُو میرے پہلو میں ہے ــــ میرا دل خوش ہے۔"

"ہوا تو بہت تیز ہو گی؟"

"بہت تیز، معلوم ہو رہا تھا، کہ دنیا کے تمام شیطان مل کر اپنے منحوس پَر پھڑپھڑا رہے ہیں - جال ٹُوٹ گیا - رسیاں کٹ گئیں - اور کشتی کا مُنہ بھی ٹُوٹتے ٹُوٹتے بچا۔" پھر اس گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے "مگر تم شب بھر کیا کرتی رہی ہو پیاری؟"

بیوی کسی چیز کا خیال کر کے کانپی - اور لرزاں آواز میں جواب دیا "میں! ــــ آہ، کچھ بھی نہیں ــــ سیتی پروتی رہی، تمہاری

دراتھکتی رہی ـــــــ لہریں بجلی کی طرح کڑک رہی تھیں - مجھے سخت ڈر لگ رہا تھا "

"ڈر! ـــــــ ہم لوگوں کو ڈر کس بات کا ـــــــ "

"اور ہاں، ہماری ہمسایہ بیوہ مرگئی ہے " بیوی نے اپنے خاوند کی بات کاٹتے ہوئے کہا -

ماہی گیر نے یہ دردناک خبر سُنی - مگر اُسے کچھ تعجب نہ ہوا اتنا اس لئے کہ وہ ہر گھڑی اس عورت کی موت کی خبر سُننے کا متوقع تھا - اُس نے آہ بھری، اور صرف اتنا کہا " بیچاری سدھار گئی ہے "!

" ہاں، اور دو بچے چھوڑ گئی ہے، جو لاش کے پہلو میں لیٹے ہوئے ہیں "

یہ سُن کر ماہی گیر کا جسم زور سے کانپا - اور اُسکی صورت سنجیدہ و متفکر ہوگئی - ایک کونے میں اپنی اُونی ٹوپی، جو پانی سے بھیگ رہی تھی - پھینک کر سر کھجلایا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنے آپ سے بولا :-

" پانچ بچے تھے، اب سات ہو گئے ـــــــ اس سے پیشتر ہی اس تُند موسم میں ہمیں دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا - اب مگر خیر ـــــــ یہ میرا قصور نہیں - اس قسم کے حوادث بہت گرے

معانی رکھتے ہیں "

وُہ کچھ عرصے تک اسی طرح اپنا سر گھٹنوں میں دبائے سوچتا رہا۔ اسے یہ سمجھ نہ آتا تھا۔ کہ خدا نے ان بچوں سے جو اس کی مُٹھی کے برابر بھی نہیں۔ ماں کیوں چھین لی۔ ہے؟ ــــ اُن بچوں سے جو نہ کام کر سکتے ہیں۔ اور نہ کسی چیز کی خواہش ہی کر سکتے ہیں ــــ اُس کا دماغ ان سوالوں کا کوئی حل نہ پیش کر سکا: وہ بڑبڑاتا ہُوا اُٹھا۔

"شاید ایسی چیزوں کو ایک پڑھا لکھا ہی سمجھ سکتا ہے" اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا: "پیاری جاؤ انہیں یہاں لے آؤ۔ وہ کس قدر وحشت زدہ ہوں گے اگر وہ صبح اپنی ماں کی لاش کے پاس بیدار ہوئے ــــ اُن کی ماں کی روح سخت بیقرار ہوگی۔ جاؤ اُنہیں ابھی لے کر آؤ"

یہ کہکر وہ دل میں سوچنے لگا۔ کہ وہ ان بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالیگا۔ وہ بڑے ہو کر اس کے گھٹنوں پر چڑھنا سیکھ جائینگے۔ خدا اُن اجنبیوں کو جھونپڑی میں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ اور اُنہیں زیادہ کھانے کو عطا کرے گا۔

"تمہیں فکر نہیں کرنی چاہئے، پیاری! ــــ میں زیادہ محنت سے کام کروں گا" اور پھر اپنی بیوی کو چارپائی کی طرف روانہ

ہوتے دیکھ کر بلند آواز میں کہنے لگا "مگر تم سوچ کیا رہی ہو۔
اس دھیمی چال سے نہیں چلنا چاہیئے تمہیں"۔
ماہی گیر کی بیوی نے چارپائی کے پاس پہنچ کر چادر کو اُلٹ دیا۔
"وہ تو یہ ہیں"
دو ننھے بچے صبح کی طرح مسکرا رہے تھے۔

(یکم فروری ۱۹۳۵ء)

تماشا

دو تین روز سے طیّارے سیاہ عقابوں کی طرح پر پھیلائے خاموش فضا میں منڈلا رہے تھے۔ جیسے وہ کسی شکار کی جستجو میں ہوں۔ سرخ آندھیاں وقتاً فوقتاً کسی آنیوالے خونی حادثہ کا پیغام لا رہی تھیں۔ سنسان بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت ایک عجیب ہیبتناک سماں پیش کر رہی تھی۔ وہ بازار جو صبح سے کچھ عرصہ پہلے لوگوں کے ہجوم سے پُر ہُوا کرتے تھے۔ اب کسی نہ معلوم خوف کی وجہ سے سُونے پڑے تھے —— شہر کی فضا پر ایک پراسرار خاموشی مسلّط تھی۔ بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔

خالد گھر کی خاموش و پُر سکون فضا سے سہما ہوا اپنے والد کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"ابّا، آپ مجھے سکول کیوں نہیں جانے دیتے؟"

"بیٹا آج سکول میں چھٹی ہے "

" ماسٹر صاحب نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں ۔ وہ تو کل کہہ رہے تھے کہ جولڑکا آج سکول کا کام ختم کر کے اپنی کاپی نہ دکھائے گا ۔ اُسے سخت سزا دی جائیگی"

" وہ اطلاع دینی بھول گئے ہونگے "

"آپ کے دفتر میں بھی چھٹی ہو گی؟"

"ہاں ہمارا دفتر بھی آج بند ہے "

" چلو اچھا ہُوا ——— آج میں آپ سے کوئی اچھی سی کہانی سنوں گا"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تین چار طیارے چیختے ہوئے اُن کے سر پر سے گزر گئے ۔ خالد اُن کو دیکھ کر بہت خوفزدہ ہُوا ، وہ تین چار روز سے ان طیاروں کی پرواز کو بغور دیکھ رہا تھا ۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا ۔ وہ حیران تھا کہ یہ جہاز سارا سارا دن دھوپ میں کیوں چکر لگاتے رہتے ہیں ۔ وہ اُن کی روزانہ نقل و حرکت سے تنگ آ کر بولا ۔

"ابّا مجھے ان جہازوں سے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے ۔ آپ اُن کے چلانے والوں سے کہہ دیں کہ وہ ہمارے گھر پر سے نہ گذرا کریں"

"خوف! ——— کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے خالد"

" ابا، یہ جہاز بہت خوفناک ہیں۔ آپ نہیں جانتے یہ کسی نہ کسی روز ہمارے گھر پر گولہ پھینک دیں گے ـــــ کل صبح ماما امّی جان سے کہہ رہی تھی۔ کہ ان جہاز والوں کے پاس بہت سے گولے ہیں۔ اگر انہوں نے اس قسم کی کوئی شرارت کی، تو یاد رکھیں میرے پاس بھی ایک بندوق ہے ـــــ وہی جو آپ نے پچھلی عید پر مجھے دی تھی "

خالد کا باپ اپنے لڑکے کی غیر معمولی عبارت پر ہنسا " ماما تو پاگل ہے، میں اس سے دریافت کروں گا۔ کہ وہ گھر میں ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہے ـــــ اطمینان رکھو، وہ ایسی بات ہرگز نہیں کرینگے "

اپنے والد سے رخصت ہو کر خالد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور ہوائی بندوق نکال کر نشانہ لگانے کی مشق کرنے لگا۔ تاکہ اس روز جب ہوائی جہاز والے گولے پھینکیں۔ تو اس کا نشانہ خطانہ جائے۔ اور وہ پوری طرح انتقام لے سکے ـــــــ کاش! انتقام کا یہی ننھا جذبہ ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔

اسی عرصے میں جبکہ ایک ننھا بچہ اپنے انتقام لینے کی نکرمیں ڈوبا ہوا طرح طرح کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ گھر کے دوسرے حصّے میں خالد کا باپ اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا ماما کو ہدایت کر رہا تھا۔

کہ وہ آئیندہ گھر میں اس قسم کی کوئی بات نہ کرے جس سے خالد کو دہشت ہو۔

ماما اور بیوی کو اسی قسم کی مزید ہدایات دیکر وہ ابھی کمرے کے دروازے سے باہر جا رہا تھا کہ خادم ایک دہشتناک خبر لایا۔ کہ شہر کے لوگ بادشاہ کے منع کرتے پر بھی شام کے قریب ایک عام جلسہ کرنے والے ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے۔ کہ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش آ کر رہے گا۔

خالد کا باپ یہ خبر سُن کر بہت خوفزدہ ہُوا۔ اب اُسے یقین ہو گیا۔ کہ فضا کا غیر معمولی سکون۔ طیاروں کی پرواز، بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت، لوگوں کے چہروں پر اُداسی کا عالم اور خونی آندھیوں کی آمد کسی خوفناک حادثہ کی پیش خیمہ تھے۔

وہ حادثہ کس نوعیت کا ہو گا؟ —— یہ خالد کے باپ کی طرح کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ مگر پھر بھی سارا شہر کسی نامعلوم خوف میں لپٹا ہُوا تھا۔

باہر جانے کے خیال کو ملتوی کر کے خالد کا باپ ابھی کپڑے تبدیل کرنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ طیاروں کا شور بلند ہُوا۔ وہ سہم گیا —— اُسے ایسا معلوم ہُوا، جیسے سینکڑوں انسان ہم آہنگ آوازیں درد کی شدّت سے کراہ رہے ہیں۔

خالد طیاروں کا شور وغل سُنکر اپنی ہوائی بندوق سنبھالتا ہُوا کمرے سے باہر دوڑا آیا۔ اور انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ تاکہ وہ جس وقت گولہ پھینکنے لگیں۔ تو وہ اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے اُنہیں نیچے گرادے ـــــ اسوقت چھ سال کے بچے کے چہرے پر آہنی ارادہ واستقلال کے آثار نمایاں تھے۔ جو کم حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں تھامے ایک جرّی سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ آج اُس چیز کو جو اُسے عرصے سے خوفزدہ کر رہی تھی۔ منّا نے پر تولا ہُوا ہے۔

خالد کے دیکھتے دیکھتے ایک جہاز سے کچھ چیز گری۔ جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے مشابہ تھی۔ گرتے ہی یہ ٹکڑے ہوا میں پتنگوں کی طرح اڑنے لگے۔ ان میں سے چند خالد کے مکان کی بالائی چھت پر بھی گرے۔

خالد بھاگا ہُوا اوپر گیا۔ اور وہ کاغذ اٹھا لایا۔

" ابّاجی ـــــ امّا سچ مُچ جھوٹ بک رہی تھی۔ جہاز والوں نے تو گولوں کی بجائے یہ کاغذ پھینکے ہیں "

خالد کے باپ نے وُہ کاغذ لیکر پڑھنا شروع کیا۔ تو رنگ زرد ہوگیا ـــ ہونیوالے حادثے کی تصویر اب اُسے عیاں طور پر نظر

آنے لگی۔ اُس اشتہار میں صاف لکھا تھا۔ کہ بادشاہ کسی جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر اُس کی مرضی کے خلاف کوئی جلسہ کیا گیا۔ تو نتائج کی ذمہ دار خود رعایا ہو گی۔

اپنے والد کو اشتہار پڑھنے کے بعد اسقدر حیران و پریشان دیکھ کر خالد نے گھبراتے ہوئے کہا " اس کاغذ میں یہ تو نہیں لکھا۔ کہ وہ ہمارے گھر پر گولے پھینکیں گے" ؟

" خالد، اس وقت تم جاؤ ! —— جاؤ اپنی بندوق کے ساتھ کھیلو"!

" مگر اس پر لکھا کیا ہے" ؟

" لکھا ہے کہ آج شام کو ایک تماشا ہو گا" خالد کے باپ نے گفتگو کو مزید طول دینے کے خوف سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

" تماشا ہو گا ! —— پھر تو ہم بھی چلیں گے نا" ؟

" کیا کہا" ؟

" کیا اس تماشے میں آپ مجھے نہ لے چلیں گے" ؟

" لے چلیں گے ! —— اب جاؤ جا کر کھیلو" !

" کہاں کھیلوں ؟ —— بازار میں آپ جانے نہیں دیتے — ماما مجھ سے کھیلتی نہیں، میرا ہم جماعت طفیل بھی تو آج کل یہاں نہیں

آتا۔ اب میں کھیلوں تو کس سے کھیلوں ؟ —— شام کے وقت تماشا دیکھنے تو ضرور چلیں گے نا"؟

کسی جواب کا انتظار کئے بغیر خالد کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور مختلف کمروں میں آوارہ پھرتا ہوا اپنے والد کی نشستگاہ میں پہنچا۔ جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھکر وہ بازار کی طرف جھانکنے لگا۔

کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں۔ مگر آمدورفت جاری ہے —— لوگ جلسے میں شریک ہونے کے لئے جا رہے تھے۔ وہ سخت حیران تھا۔ کہ دو تین روز سے دکانیں کیوں بند رہتی ہیں اس مسئلہ کے حل کے لئے اُس نے اپنے ننھے دماغ پر بہتیرا زور دیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔

بہت غور و فکر کے بعد اُس نے یہ سوچا کہ لوگوں نے اُس تماشا دیکھنے کی خاطر جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے دکانیں بند کر رکھی ہیں۔ اب اس نے خیال کیا۔ کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہوگا۔ جس کے لئے تمام بازار بند ہیں۔ اس خیال نے خالد کو سخت بے چین کر دیا۔ اور وہ اس وقت کا نہایت بیقراری سے انتظار کرنے لگا۔ جب اُس کا ابّا اُسے تماشا دکھلانے کو لیجائے۔

وقت گزرتا گیا ـــــ وہ خونی گھڑی قریب تر آتی گئی۔
سہ پہر کا وقت تھا۔ خالد، اس کا باپ اور والدہ صحن میں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے تک رہے تھے۔
ـــــ ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔
تڑ۔ تڑ۔ تڑ۔ تڑ . . . .
یہ آواز سنتے ہی خالد کے باپ کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا۔ زبان سے بمشکل اسقدر کہہ سکا "۔ گولی "
خالد کی ماں فرطِ خوف سے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکال سکی۔ گولی کا نام سُنتے ہی اسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے خود اس کی چھاتی سے گولی اُتر رہی ہے۔
خالد اس آواز کو سُنتے ہی اپنے والد کی اُنگلی پکڑ کر کہنے لگا:۔
"آباجی چلو چلیں! تماشا تو شروع ہو گیا ہے!"
"کونسا تماشا؟" خالد کے باپ نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا۔
"وہی تماشا جس کے اشتہار آج صبح بانٹ رہے تھے ـــ کھیل شروع ہو گیا ہے، تبھی تو اتنے پٹاخوں کی آواز سنائی دے رہی ہے"

ٹانگ سے بہت خون نکل رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی خالد کا باپ کھڑکی کی طرف گیا۔ اور دیکھا کہ واقعی ایک نوجوان لڑکا بازار میں اوندھے منہ پڑا ہے۔

بادشاہ کے خوف سے اُسے جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ اس لڑکے کو سڑک پر سے اُٹھا کر سامنے والی دکان کے پٹڑے پر لٹا دے۔

—— بے ساز و برگ افراد کو اٹھانے کے لئے حکومت کے ارباب حل وعقد نے آہنی گاڑیاں مہیّا کر رکھی ہیں۔ مگر اس معصوم بچے کی نعش جو انہی کی تیغ ستم کا شکار تھی۔ وہ نھا پودا جو انہی کے ہاتھوں مسلا گیا تھا۔ وہ کونپل جو کھِلنے سے پہلے انہی کی عطا کردہ بادِ سموم سے جھلس گئی تھی۔ کسی کے دل کی راحت جو انہی کے جور واستبداد نے چھین لی تھی۔ اب اُنہی کی تیار کردہ سڑک پر —— آہ! موت بھیانک ہے، مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور بھیانک ہے۔

"ابّا اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے؟"

خالد کا باپ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب خالد اکیلا کمرے میں رہ گیا۔ تو سوچنے لگا۔ کہ اس لڑکے کو اتنے بڑے زخم سے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ جبکہ ایک دفعہ اُسے

قلم تراش کی نوک چبھنے سے تمام رات نیند نہ آئی تھی۔ اور اُس کا باپ اور ماں تمام رات اُس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی اُسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ زخم خود اس کی پنڈلی میں ہے۔ اور اس میں شدّت کا درد ہے ـــــ یکلخت وہ رونے لگ گیا۔

اس کے رونے کی آواز سُن کر اسکی والدہ دوڑی دوڑی آئی۔ اور اُسے گود میں لے کر پوچھنے لگی:۔ "میرے بچے رو کیوں رہے ہو"؟

"امّی، اس لڑکے کو کسی نے مارا ہے"؟

"شرارت کی ہوگی اس نے"؟

خالد کی والدہ اپنے خاوند کی زبانی زخمی لڑکے کی داستان سُن چکی تھی۔

"مگر سکول میں تو شرارت کرنے پر چھڑی سے سزا دیتے ہیں۔ لہو تو نہیں نکالتے"؛ خالد نے روتے ہوئے اپنی والدہ سے کہا۔

"چھڑی زور سے لگ گئی ہوگی!"

"تو پھر کیا اس لڑکے کا والد سکول میں جا کر اس استاد پر خفا نہ ہوگا جس نے اُس کے لڑکے کو اس قدر مارا ہے۔ ایک روز

جب ماسٹر صاحب نے میرے کان کھینچکر سُرخ کر دیئے تھے تو آبا جی نے ہیڈ ماسٹر کے پاس جاکر شکایت کی تھی نا؟"

"اس لڑکے کا ماسٹر بہت بڑا آدمی ہے "

"اللہ میاں سے بھی بڑا؟"

"نہیں اُن سے چھوٹا ہے "

"تو پھر وہ اللہ میاں کے پاس شکایت کرے گا"

"خالد، اب دیر ہو گئی ہے، چلو سوئیں "

"اللہ میاں! میں دعا کرتا ہوں۔ کہ تو اِس ماسٹر کو جس نے اِس لڑکے کو پیٹا ہے۔ اچھی طرح سزا دے۔ اور اُس چھڑی کو چھین لے جس کے استعمال سے خون نکل آتا ہے ــــ میں نے پہاڑے یاد نہیں کئے۔ اسلئے مجھے ڈر ہے۔ کہ کہیں وہی چھڑی میرے اُستاد کے ہاتھ نہ آجائے ــــ اگر تم نے میری باتیں نہ مانیں، تو پھر میں بھی تم سے نہ بولوں گا"

سوتے وقت خالد دل میں دُعا مانگ رہا تھا۔

طاقت کا امتحان

"کھیل خوب تھا —— کاش تم بھی وہاں موجود ہوتے۔
"مجھے کل کچھ ضروری کام تھا، مگر اس کھیل میں کونسی چیز ایسی قابلِ دید تھی۔ جس کی تم اتنی تعریف کر رہے ہو؟"
"ایک صاحب نے چند جسمانی ورزشوں کے کرتب دکھلائے۔ کہ ہوش گم ہو گیا۔"
"مثلاً"
"مثلاً، کلائی پر ایک انچ موٹی آہنی سلاخ کو خم دینا ——"
"یہ آجکل بچے بھی کر سکتے ہیں۔"
"چھاتی پہ چکی کا پتھر رکھوا کر آہنی ہتھوڑوں سے پاش پاش کرانا۔"

"میں نے ایسے بیسیوں شخص دیکھے ہیں"

"مگر وہ وزن جو اس نے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ایک تنکے کی طرح پرے پھینک دیا کسی اور شخص کے بس کی بات نہیں ـــــــ یہ تمہیں بھی ماننا پڑیگا"

"بھلے آدمی یہ کونسا اہم کام ہے ـ وزن کتنا تھا آخر؟"

"کوئی چار من کے قریب ہوگا ـ کیوں؟"

"اتنا وزن تو شہر کا فاقہ زدہ مزدور گھنٹوں پشت پر اٹھائے رہتا ہے"

"بالکل غلط!"

"وہ کیوں؟"

"غلیظ ٹکڑوں پر پلے ہوئے مزدور میں اتنی قوت نہیں ہو سکتی ـ طاقت کیلئے اچھی غذا کا ہونا لازم ہے ـــــ شہر کا مزدور! ـ کیسی باتیں کر رہے ہو!"

غذا اور اس معاملے کے متعلق میں تم سے متفق ہوں ـ مگر حقیقت ہے ـــــ یہاں ایسے بیسیوں مزدور ہیں ـ جو دو پیسے کی خاطر چار من بلکہ اس سے کچھ زیادہ وزن اٹھا کر تمہارے گھر کی دوسری منزل پر چھوڑ آسکتے ہیں ـــــــ کہو تو اسے ثابت کر دوں؟"

یہ گفتگو دو نوجوان طلباء میں ہو رہی تھی ـ جو ایک پر تکلف کمرے کی گدّے دار

کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ کا دھواں اُڑا رہے تھے۔

"میں اسے ہرگز نہیں مان سکتا، اور بارہ آنے بھی کس طرح ــــــ قاسم چوب فروش کے مزدور ہی کو لو کمبخت سے ایک من لکڑیاں بھی تو اٹھائی نہیں جاتیں۔ ہزاروں میں ایک ایسا طاقتور ہو، تو کوئی اچنبا نہیں ہے"۔

چھوڑو یار، اس قصّے کو، بھاڑ میں جائیں، یہ سب مزدور، اور چولھے میں جائے ان کی طاقت۔ سناؤ آج تاش کی بازی لگ رہی ہے؟"

"تاش کی بازیاں تو لگتی ہی رہینگی۔ پہلے اس بحث کا فیصلہ ہونا چاہئے"۔

سامنے والی دیوار پر آویزاں کلاک ہر روز اسی قسم کی لاعینی گفتگوؤں سے تنگ آ کر برابر اپنی ٹِک ٹِک کئے جا رہا تھا۔ سگریٹ کا دھواں اُنکے مُنہ سے آزاد ہو کر بڑی بے پروائی سے چکر لگاتا ہوا کھڑکی کے راستے باہر نکل رہا تھا۔ دیواروں پر لٹکی ہوئی تصاویر کے چہروں پر بے فکری و بے اعتنائی کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ کمرے کا فرنیچر سالہا سال سے ایک ہی جگہ پر جما ہوا کسی تغیر سے ناامّید ہو کر بے حس پڑا سوتا تھا۔ آتشدان کے طاق پر رکھا ہوا کسی یونانی مفکّر کا مجسمہ اپنی سنگین نگاہوں سے آدم کے ان دو فرزندوں کی بے معنی گفتگو سنکر تعجّب سے اپنا سر کھجلا رہا تھا ــــــ کمرے کی فضا ان بھدّی اور فضول باتوں سے کثیف ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک دونو دوست تاش کی مختلف کھیلوں، برج کے اصولوں اور روپیہ جیتنے کے طریقوں پر اظہارِ خیالات کرتے رہے۔ دفعتاً اُن میں وُہ جسے مزدوروں کی طاقت کے متعلق پورا یقین تھا اپنے دوست سے مخاطب ہُوا۔

" باہر بازار میں لوہے کا جو گارڈر پڑا ہے، وہ تمہارے خیال میں کتنا وزن رکھتا ہوگا؟"

"پھر وہی بحث !"

"تم بتاؤ تو سہی ۔"

"پانچ چھ من کے قریب ہوگا۔"

"یہ وزن تو تمہاری نظر میں کافی ہے نا؟"

"یعنی تمہارا یہ مطلب ہے کہ لوہے کی یہ بھاری بھرکم لاٹھ تمہارا مزدور پہلوان اٹھائے گا ـــــــ گدھے والی گاڑی ضرور ہوگی اس کے ساتھ !"

" یہاں کے مزدور بھی گدھوں سے کیا کم ہیں۔ گیہوں کی دو تین بوریاں اُٹھانا تو اُن کے نزدیک معمولی کام ہے ـــــــ مگر تمہیں کیا پتہ ہوسکتا ہے۔ کہو تو، تمہارے کل والے کھیل سے کہیں حیرت انگیز اور بہت سستے داموں ایک نیا تماشا دکھاؤں؟"

"اگر تمہارا مزدور لوہے کا وہ وزنی ٹکڑا اٹھائے گا۔ تو میں تیار ہوں"
"تمہاری آنکھوں کے سامنے اور بغیر کسی چالاکی کے۔"

دونوں دوست اپنے اپنے سیگریٹ کی خاکدان میں گردن دبا کر اٹھے اور باہر بازار کی طرف مزدور کی طاقت کا امتحان کرنے چل دیئے ـــــ کمرے کی تمام اشیاء کسی گہری فکر میں غرق ہو گئیں۔ جیسے اُنہیں کسی غیر معمولی حادثے کا خوف ہو، کلاک اپنی انگلیوں پر کسی متعیّنہ وقت کی گھڑیاں شمار کرنے لگا۔ دیواروں پر آویزاں تصویریں حیرت میں ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگیں ـــــ کمرے کی فضا خاموش آہیں بھرنے لگ گئی۔

لوہے کا وہ بھاری بھرکم ٹکڑا لاش کا سا سرد اور کسی وحشتناک خواب کی طرح تاریک، بازار کے ایک کونے میں کسی بھیانک دیو کی مانند اکڑا ہوا تھا۔ دونوں دوست لوہے کے اس ٹکڑے کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ اور کسی مزدور کا انتظار کرنے لگے۔

بازار بارش کی وجہ سے کیچڑ میں لت پت تھا، جو راہگیروں کے جوتوں کے ساتھ اُچھل اُچھل کر ان کا مضحکہ اُڑا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا گویا وہ اپنے روندنے والوں سے کہہ رہی ہے، کہ وہ اسی آب و گل کی تخلیق ہیں۔ جسے وہ اس وقت پاؤں سے گوندھ رہے ہیں۔ مگر وہ اس

حقیقت سے غافل اپنے دنیاوی کام دھندوں کی دُھن میں مصروف کیچڑ کے سینے کو مسلتے ہوئے اِدھر اُدھر جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے جا رہے تھے۔

کچھ دکاندار اپنے گاہکوں کے ساتھ سودا سلف کرنے میں مصروف تھے۔ اور کچھ سجی ہوئی دکانوں میں تکیہ لگائے اپنے حریف ہم پیشہ دکانداروں کی طرف حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور اس وقت کے منتظر تھے کہ کوئی گاہک وہاں سے ہٹے اور وہ اُسے کم قیمت کا جھانسا دیکر گھٹیا مال فروخت کریں۔

ان منیاری کی دکانوں کے ساتھ ہی ایک دوا فروش اپنے مریض گاہکوں کا انتظار کر رہا تھا ـــــ بازار میں سب لوگ اپنے اپنے خیال میں مست تھے۔ اور یہ دو دوست کسی دنیاوی فکر سے بے پروا ایک ایسے مزدور کی راہ دیکھ رہے تھے۔ جو ان کی دلچسپی کا سامان مہیا کر سکے۔

دُور بازار کے آخری سرے پر ایک مزدور کمر کے گرد رسّی لپیٹے اور پُشت پر ٹاٹ کا ایک موٹا سا ٹکڑا لٹکائے کیچڑ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

نانبائی کی دکان کے قریب پہنچکر وہ دفعتاً ٹھٹکا، سالن کی دیگچیوں،

اور تنور سے تازہ نکلی ہوئی روٹیوں نے اسکے پیٹ میں نوکدار خنجروں کا کام کیا۔

مزدور نے اپنی پھٹی ہوئی جیب کی طرف نگاہ کی۔ اور گرسنہ دانتوں سے اپنے خشک لبوں کو کاٹ کر خاموش رہ گیا۔ سرد آہ بھری۔ اور اُسی رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ چلتے وقت اس کے کان بڑی بے صبری سے کسی کی دلخوش کُن آواز "مزدور" کا انتظار کر رہے تھے مگر اس کے دل میں نہ معلوم کیا کیا خیالات چکّر لگا رہے تھے۔

" دو تین دن سے روٹی بمشکل نصیب ہوئی ہے۔ اب چار بجنے کو آئے ہیں۔ مگر ایک کوڑی تک نہیں ملی ——— کاش آج صرف ایک روٹی کے لئے ہی کچھ نصیب ہو جائے! ——— بھیک؟ ——— نہیں خدا کارساز ہے!"

اس نے بھوک سے تنگ آکر بھیک مانگنے کا خیال کیا۔ مگر اسے ایک مزدور کی شان کے خلاف سمجھتے ہوئے خدا کا دامن تھام لیا۔ اور اس خیال سے مطمئن ہو کر جلدی جلدی اس بازار کو طے کرنے لگا ——— اس خیال سے کہ شاید دوسرے بازار میں اسے کچھ نصیب ہو جائے۔

دو نو دوستوں نے بیک وقت ایک مزدور کو تیزی سے اپنی طرف قدم بڑھاتے دیکھا ——— مزدور دُبلا پتلا نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً

آواز دی۔

"مزدور!"

یہ سنتے ہی گویا مزدور کے سوکھے دھانوں میں پانی مل گیا بھاگا ہُوا آیا۔ اور نہایت ادب سے پوچھنے لگا۔

"جی حضور"

"دیکھو، لوہے کا یہ ٹکڑا اٹھا کر ہمارے ساتھ چلو۔ ــــ کتنے پیسے لو گے؟"

مزدور نے جُھک کر لوہے کے بھاری بھر کم ٹکڑے کی طرف دیکھا۔ اور دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کی وہ چمک جو "مزدور" کا لفظ سُنکر پیدا ہوئی تھی، غائب ہوگئی۔

وزن بلا شک و شبہ زیادہ تھا مگر روٹی کے فکر اور پیٹ پوجا کے لئے سامان پیدا کرنے کا سوال اس سے کہیں وزنی تھا۔

مزدور نے ایک بار پھر اس آہنی لاٹھ کی طرف دیکھا۔ اور دل میں عزم کرنے کے بعد کہ وہ اسے ضرور اُٹھائے گا۔ اُن سے بولا:۔

"جو حضور فرمائیں"

"یعنی تم یہ وزن اکیلے اٹھا لو گے؟" ان دو لڑکوں میں سے اُس نے مزدور کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ جو کل شب جسمانی کرتب

دیکھ کر آیا تھا۔

"بولو کیا لوگے؟ ــــ یہ وزن بھلا کہاں سے زیادہ ہُوا" دوسرے نے بات کا رُخ پلٹ دیا۔

"کہاں تک جانا ہوگا حضور!"

"بہت قریب ــــ دوسرے بازار کے نکڑ تک"۔

"وزن زیادہ ہے، آپ تین آنے دیدیجئے"۔

"تین آنے!"

"جی ہاں، تین آنے کچھ زیادہ تو نہیں ہیں"۔

"دو آنے مناسب ہے بھئی"۔

دو آنے ــــ آٹھ پیسے، یعنی دو وقت کے لئے سامان خورد و نوش۔ یہ سوچتے ہی مزدور راضی ہوگیا۔ اُس نے اپنی کمر سے رسّی اُتاری۔ اور اُسے لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا ــــ دو تین جھٹکوں کے بعد وہ آہنی سلاخ اس کی کمر پر تھی۔

گو وزن واقعی ناقابلِ برداشت تھا مگر تھوڑے عرصے کے بعد ملنے والی روٹی نے مزدور کے جسم میں عارضی طور پر ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی تھی۔ اب اُن کاندھوں میں جو بھوک کی وجہ سے مردہ ہو رہے تھے، روٹی کا نام سنکر تمام طاقت عود کر آئی۔

گرسنہ انسان بڑی سے بڑی مشقت فراموش کر دیتا ہے ۔ جب اُسے اپنے پیٹ کے لئے کچھ سامان نظر آتا ہے ۔

" آیئے " مزدور نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا ۔

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف نگاہیں اُٹھائیں اور زیرِلب مُسکرا دئیے ـــــ وہ بہت مسرور تھے ۔

" چلو ـــــ مگر ذرا جلدی قدم بڑھاؤ ۔ ہمیں کچھ اور بھی کام کرنا ہے " مزدور ان دو لڑکوں کے پیچھے ہو لیا ـــــ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ موت اس کے کاندھوں پر سوار ہے ۔

" کیوں میاں ! کہاں ہے وہ تمہارا کل والا سینڈو ؟ "

" کمال کر دیا ہے اس مزدور نے ، واقعی سخت تعجب ہے ! "

" تعجب ! ـــ اگر کہو تو اس لوہے کے ٹکڑے کو تمہارے گھر کی بالائی چھت پر رکھوا دوں "

" مگر سوال ہے کہ ہم لوگ اچھی غذا ملنے پر بھی اتنے طاقتور نہیں ہیں "

" ہماری غذا تو کتابوں اور دیگر علمی چیزوں کی نذر ہو جاتی ہے ـــ اُنہیں اس قسم کی سردردی سے کیا تعلق ؟ ـــ بےفکری ، کھانا اور سو جانا "

" واقعی درست ہے "

لڑکے مزدور پر لدے ہوئے بوجھ اور اسکی خمیدہ کمر سے غافل آپس میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔
وہاں سے سو قدم کے فاصلے پر مزدور کی قضا کیلئے کیچڑ میں چھپی ہوئی اپنے شکار کا انتظار کر رہی تھی۔ گو مزدور کیچڑ میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ مگر تقدیر کے آگے تدبیر کی ایک بھی پیش نہ چلی۔ اس کا قدم چھلکے پر پڑا۔ بھلا اور چشم زدن میں لوہے کی اس بھاری لاٹھ نے اسے کیچڑ میں پیوست کر دیا۔
مزدور نے ترحم نگاہوں سے کیچڑ اور لوہے کے سرد ٹکڑے کی طرف دیکھا۔ تڑپا اور ہمیشہ کیلئے بھوک کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔
دھماکے کی آواز سُنکر دونوں لڑکوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ — مزدور کا سر آہنی سلاخ کے نیچے کچلا ہوا تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی نہ معلوم کس سمت ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں۔ خون کی ایک موٹی سی تہ کیچڑ کے ساتھ ہم آغوش ہو رہی تھی۔
"چلو آؤ چلیں — ہمیں خواہ مخواہ اس حادثے کا گواہ بننا پڑے گا۔
"میں پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ کہ یہ وزن اُس سے نہیں اُٹھایا

جائے گا ــــ لالچ !"

یہ کہتے ہوئے دونوں لڑکے مزدور کی لاش کے گرد جمع ہوتی ہوئی بھیڑ کو کاٹتے ہوئے اپنے گھر روانہ ہوگئے ۔

سامنے والی دکان پر ایک بڑی توند والا شخص ٹیلیفون کا چونگا ہاتھ میں لئے غالباً گندم کا بھاؤ طے کر رہا تھا۔ کہ اس نے مزدور کو موت کا شکار ہوتے دیکھا۔ اور اس حادثے کو منحوس خیال کرتے ہوئے بڑبڑا کر ٹیلیفون کا سلسلۂ گفتگو منقطع کر لیا ۔

"کمبخت کو مرنا بھی تھا۔ تو میری دکان کے سامنے ــــ بھلا ان لوگوں کو استدر وزن اٹھانے پر کون مجبور کرتا ہے "!

تھوڑی دیر کے بعد اسپتال کی آہنی گاڑی آئی۔ اور مزدور کی لاش اٹھا کر عمل جراحی کے لئے ڈاکٹروں کے سپرد کردی ۔

دھندلے آسمان پر ابر کے ایک ٹکڑے نے مزدور کے خون کو کیچڑ میں ملتے ہوئے دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے ۔ ــــ ان آنسوؤں نے سڑک کے سینے پر اس خون کے دھبّوں کو دھو دیا۔

آہنی لاٹھ ابھی تک بازار کے ایک کنارے پڑی ہوئی ہے۔ مزدور کے خون کا صرف ایک قطرہ باقی ہے ۔ جو دیوار کے ساتھ

چھپا ہوا نہ معلوم کس چیز کا اپنی خونیں آنکھوں سے انتظار کر رہا ہے ۔

(۵ - جنوری ۳۵ء)
اشاعت اول ـــــ "ہفتہ وار حق"
اشاعت ثانی ـــــ "عالمگیر"

دیوانہ شاعر

[اگر مقدس حق دنیا کی متجسس نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے۔ تو
رحمت ہو اس دیوانے پر جو انسانی دماغ پر سنہرا خواب طاری کر
دے۔] (حکیم گورکی)

میں آہوں کا بیوپاری ہوں،
لہو کی شاعری میرا کام ہے،
چمن کی مانندہ ہواؤ!
اپنے دامن سمیٹ لو — کہ
میرے آتشیں گیت،
دبے ہوئے سینوں میں ایک تلاطم برپا کرنے والے ہیں،
یہ بے باک نغمہ درد کی طرح اٹھا، اور باغ کی فضا میں چند لمحے تھرتھرا

کر ڈوب گیا۔ آواز میں ایک قسم کی دیوانگی تھی ۔ ناقابلِ بیان! میرے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ میں نے آواز کی جستجو میں اِدھر اُدھر نگاہیں اٹھائیں سامنے چبوترے کے قریب گھاس کے تختے پر چند بچے اپنی ماماؤں کے ساتھ کھیل کود میں مو تھے؛ پاس ہی دو تین گنوار بیٹھے ہوئے تھے۔ بائیں طرف نیم کے درخت کے نیچے مالی زمین کھودنے میں مصروف تھا۔ میں ابھی اسی جستجو میں ہی تھا کہ وہی درد میں ڈوبی ہوئی آواز پھر بلند ہوئی۔

میں اُن لاشوں کا گیت گاتا ہوں،
جن کی سردی دسمبر مستعار لیتا ہے۔
میرے سینے سے نکلی ہوئی آہ
وہ لُو ہے جو جون کے مہینے میں چلتی ہے۔
میں آہوں کا بیوپاری ہوں۔
لہو کی شاعری میرا کام ہے ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

آواز کنوئیں کے عقب سے آرہی تھی۔ مجھ پر ایک رقت سی طاری ہوگئی۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ سرد اور گرم لہریں بیک وقت میرے جسم سے لپٹ رہی ہیں۔ اس خیال نے مجھے کسی قدر خوفزدہ کردیا۔ کہ آواز اُسی کنوئیں کے قریب سے بلند ہورہی ہے جس میں آج سے کچھ سال پہلے لاشوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دماغ میں جلیانوالہ

باغ کے خونی حادثے کی ایک تصویر کھچ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ باغ کی فضا گولیوں کی سنسناہٹ اور بھاگتے ہوئے لوگوں کی چیخ پکار سے گونج رہی ہے۔ میں لرز گیا۔ اپنے کاندھوں کو زور سے جھٹکا دے کر اور اس عمل سے اپنے خوف کو دُور کرتے ہوئے میں اٹھا۔ اور کنوئیں کا رُخ کیا۔

سارے باغ پر ایک پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میرے قدموں کے نیچے خشک پتوں کی سرسراہٹ سوکھی ہوئی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ کوشش کے باوجود میں اپنے دل سے وہ نامعلوم خوف دور نہ کر سکا۔ جو اس آواز نے پیدا کر دیا تھا۔ ہر قدم پر مجھے یہی معلوم ہوتا تھا کہ گھاس کے سبز بستر پر بے شمار لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ جن کی بوسیدہ ہڈیاں میرے پاؤں کے نیچے ٹوٹ رہی ہیں۔ یکایک میں نے اپنے قدم تیز کئے اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس چبوترے پر بیٹھ گیا۔ جو کنوئیں کے ارد گرد بنا ہوا تھا۔

میرے دماغ میں بار بار یہ عجیب سا شعر گونج رہا تھا۔

میں آہوں کا بیوپاری ہوں۔

لہو کی شاعری میرا کام ہے۔

کنوئیں کے قریب کوئی متنفس موجود نہ تھا۔ میرے سامنے چھوٹے پھاٹک کی ساتھ والی دیوار پر گولیوں کے نشان تھے۔ جن پر چوکور جالی منڈھی

ہوئی تھی۔ میں ان نشانوں کو بیسیوں مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ مگر اب وہ دونوں نین جو میری نگاہوں کے عین بالمقابل تھے۔ دو خونیں آنکھیں معلوم ہو رہے تھے۔ جو دُور ــــ بہت دُور کسی غیر مرئی چیز کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہوں۔ بلا ارادہ میری نگاہیں اُن دو چشم نما سوراخوں پر جم کر رہ گئیں۔ میں اُن کی طرف مختلف خیالات میں کھویا ہوا خدا معلوم کتنے عرصہ تک دیکھتا رہا۔ کہ دفعتہً پاس والی روش پر کسی کے بھاری قدموں کی چاپ نے مجھے اُس خواب سے بیدار کردیا۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ گلاب کی جھاڑیوں سے ایک دراز قد آدمی سر جھکائے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اُسکے بڑے کوٹ کی جیبوں میں ٹھنسے ہوئے تھے۔ چلتے ہوئے وہ زیرلب کچھ گنگنا رہا تھا۔ کنوئیں کے قریب پہنچ کر وہ یکایک ٹھٹکا۔ اور گردن اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں پانی پیونگا"

میں فوراً چبوترے پر سے اُٹھا اور پمپ کا ہینڈل ہلاتے ہوئے اس اجنبی سے کہا "آئیے"

اچھی طرح پانی پی چکنے کے بعد اُس نے اپنے کوٹ کی میلی آستین سے مُنہ پونچھا۔ اور واپس چلنے کو ہی تھا۔ کہ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے دریافت کیا۔

"کیا ابھی ابھی آپ ہی گا رہے تھے؟"

«ہاں، ـــ مگر آپ کیوں دریافت کر رہے ہیں؟» یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سر پھر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں جن میں سُرخ ڈورے غیر معمولی طرح پر نمایاں تھے۔ میری قلبی واردات کا جائزہ لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں گھبرا گیا۔

«آپ ایسے گیت نہ گایا کریں ـــ یہ سخت خوفناک ہیں۔»

«خوفناک! ـــ نہیں، انہیں ہیبت ناک ہونا چاہیئے۔ جبکہ میرے رگ کے ہر سُر میں رِستے ہوئے زخموں کی جلن اور رُکی ہوئی آہوں کی تپش معمور ہے معلوم ہوتا ہے کہ میرے شعلوں کی زبانیں آپ کی برفائی ہوئی روح کو اچھی طرح چاٹ نہیں سکیں۔» اُس نے اپنی نوکیلی ٹھوڑی کو انگلیوں سے کھجلاتے ہوئے کہا۔ یہ الفاظ اُس شور کے مشابہ تھے۔ جو برف کے ڈھیلے میں تپتی ہوئی سلاخ گزارنے سے پیدا ہوتا ہے۔

«آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔»

«میرے یہ کہنے پر اس مردِ عجیب کے حلق سے ایک قہقہہ نما شور بلند ہوا۔ ہا، ہا، ہا ..... آپ ڈر رہے ہیں۔ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ اسوقت اس منڈیر پر کھڑے ہیں۔ جو آج سے کچھ عرصہ پہلے بے گناہ انسانوں کے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ یہ حقیقت میری گفتگو سے زیادہ وحشت خیز ہے۔»

یہ سُنکر میرے قدم ڈگمگا گئے۔ میں واقعی خونیں منڈیر پر کھڑا تھا۔ مجھے

خوفزدہ دیکھ کر وہ پھر بولا:۔

" تھرائی ہوئی رگوں سے بہا ہوا لہو کبھی فنا نہیں ہوتا ۔۔۔ اس خاک کے ذرّے ذرّے میں مجھے سُرخ بوندیں تڑپتی نظر آرہی ہیں ۔ آ ؤ ، تم بھی دیکھو!"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں ۔ میں کنوئیں پر سے نیچے اُتر آیا ۔ اور اس کے پاس کھڑا ہو گیا ۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا دفعتہً اس نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا ۔ اور بڑے دھیمے لہجے میں کہا : " مگر تم اسے نہیں سمجھ سکو گے ۔۔۔ یہ بہت مشکل ہے !!"

میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا ۔ وہ غالباً مجھے اس خونی حادثے کی یاد دلا رہا تھا ۔ جو آج سے سولہ سال قبل اس باغ میں واقع ہوا تھا ۔ اُس حادثے کے وقت میری عمر قریباً پانچ سال کی تھی ۔ اس لئے میرے دماغ میں اس کے بہت دُھندلے نقوش باقی تھے ۔ لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس باغ میں عوام کے ایک جلسے پر گولیاں برسائی گئی تھیں ۔ جس کا نتیجہ قریباً دو ہزار اموات تھیں ۔ میرے دل میں اُن لوگوں کا بہت احترام تھا جنہوں نے اپنی مادرِ وطن اور جذبۂ آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں لیس اس احترام کے علاوہ میرے دل میں اس حادثے کے متعلق اور کوئی خاص جذبہ نہ تھا ۔ مگر آج اس مردِ عجیب کی گفتگو نے میرے سینے میں ایک ہیجان سا برپا کر دیا ۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ گولیاں تڑ تڑ برس رہی ہیں ۔ اور

بہت سے لوگ دہشت کے مارے اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے ایک دوسرے پر گر گر کر مر رہے ہیں۔ اس اثر کے تحت میں چلا اُٹھا ۔
" میں سمجھتا ہوں ۔۔۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں ۔ موت بھیانک ہے ۔ مگر ظلم اس سے کہیں خوفناک اور بھیانک ہے !!"
یہ کہتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے سب کچھ کہہ ڈالا ہے ۔ اور میرا سینہ بالکل خالی رہ گیا ہے ۔ مجھ پر ایک مُردنی سی چھا گئی ۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس شخص کے کوٹ کو پکڑ لیا اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا :۔
"آپ کون ہیں ؟ ۔۔۔ آپ کون ہیں ؟"
"آہوں کا بیوپاری ۔۔۔ ایک دیوانہ شاعر ۔"
"آہوں کا بیوپاری ! ۔۔۔ دیوانہ شاعر " اس کے الفاظ زیرِ لب گنگناتے ہوئے میں کنوئیں کے چبوترے پر بیٹھ گیا ۔ اس وقت میرے دماغ میں اُس دیوانے شاعر کا گیت گونج رہا تھا ۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا ۔ سامنے سپیدے کے دو درخت ہیبت ناک دیووں کی طرح انگڑائیاں لے رہے تھے ۔ پاس ہی چنبیلی اور گلاب کی خاردار جھاڑیوں میں ہوا آہیں بکھیر رہی تھی ۔ دیوانہ شاعر خاموش کھڑا سامنے والی دیوار کی ایک کھڑکی پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا ۔ شام کے خاکستری دھندلکے میں وہ ایک سایہ معلوم ہو رہا تھا ۔ کچھ دیر خموش رہنے کے بعد وہ اپنے خشک بالوں کو انگلیوں سے

کنگھی کرتے ہوئے گنگنایا۔

"آہ! یہ سب کچھ خوفناک حقیقت ہے ۔ کسی صحرا میں جنگلی انسان کے پیروں کے نشانات کی طرح خوفناک!"

"کیا کہا؟"

میں ان الفاظ کو اچھی طرح سُن نہ سکا تھا۔ جو اُس نے مُنہ ہی مُنہ میں ادا کئے تھے۔

"کچھ بھی نہیں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ میرے پاس آکر چبوترے پر بیٹھ گیا

"مگر آپ گنگنا رہے تھے"

اس پر اس نے اپنی آنکھیں ایک عجیب انداز میں سکیڑیں۔ اور ہاتھوں کو آپس میں زور زور سے ملتے ہوئے کہا۔ "سینے میں قید کئے ہوئے الفاظ باہر نکلنے کیلئے مضطرب ہوتے ہیں۔ اپنے آپ سے بولنا اس الوہیت سے گفتگو کرنا ہے۔ جو ہمارے دل کی پہنائیوں میں مستور ہوتی ہے" پھر ساتھ ہی گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے "کیا آپ نے اس کھڑکی کو دیکھا ہے؟"

اس نے اپنی انگلی اس کھڑکی کی طرف اٹھائی۔ جسے وہ چند لمحے پہلے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس جانب دیکھا۔ چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جو سامنے دیوار کی خستہ اینٹوں میں سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"یہ کھڑکی جس کا ایک ڈنڈا نیچے لٹک رہا ہے؟" میں نے اس سے کہا

"ہاں — یہی، جس کا ایک ڈنڈا نیچے لٹک رہا ہے کیا تم اس پرُ اسرار معصوم لڑکی کے خون کے چھینٹے نہیں دیکھ رہے ہو جس کو صرف اس لئے ہلاک کیا گیا تھا کہ ترکشِ استبداد کو اپنے تیروں کی قوتِ پرواز کا امتحان لینا تھا — میرے عزیز! تمہاری اس بہن کا خون ضرور رنگ لائیگا میرے گیتوں کے زیر و بم میں اس کمسن روح کی پھڑپھڑاہٹ اور اس کی دلدوز چیخیں ہیں، بے سکون کے دامن کو تار تار کر دیں گے۔ ایک ہنگامہ ہوگا سینۂ گیتی شق ہو جائے گا۔ میری بے لگام آواز بلند سے بلند تر ہو تی جائے گی۔ پھر کیا ہوگا؟ — پھر کیا ہوگا؟ — یہ مجھے معلوم نہیں — آؤ، دیکھو، اس سینے میں کتنی زبردست آگ سلگ رہی ہے"!

یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اور اسے کوٹ کے اندر لے جا کر اپنے سینے پر رکھدیا۔ اس کے ہاتھوں کی طرح اس کا سینہ بھی غیر معمولی طور پر گرم تھا۔ اسوقت اس کی آنکھوں کے ڈورے بہت اُبھرے ہوئے تھے میں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا "آپ علیل ہیں۔ کیا میں آپکو گھر چھوڑ آؤں"؟

"نہیں میرے عزیز، میں علیل نہیں ہوں"! اس نے زور سے اپنے سر کو ہلایا "یہ انتقام ہے جو میرے اندر گرم سانس لے رہا ہے۔ میں اس دبی ہوئی آگ کو اپنے گیتوں کے دامن سے ہوا دے رہا ہوں۔ کہ یہ شعلو

میں تبدیل ہو جائے ۔"

" یہ درست ہے مگر آپ کی طبیعت واقعۃً خراب ہے ۔ آپ کے ہاتھ بہت گرم ہیں ۔ اس سردی میں آپ کو زیادہ بخار ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔"

اُس کے ہاتھوں کی غیر معمولی گرمی اور آنکھوں میں اُبھرے ہوئے سُرخ ڈورے صاف طور پر ظاہر کر رہے تھے کہ اُسے کافی بخار ہے ۔

اس نے میرے کہنے کی کوئی پروا نہ کی ۔ اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر میری طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

" یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ لکڑی جلے اور دھواں نہ دے ۔۔۔ میرے عزیز ان آنکھوں نے ایسا سماں دیکھا ہے ۔ کہ انہیں اُبل کر باہر نکل آنا چاہئے تھا ۔ کیا کہہ رہے تھے کہ میں علیل ہوں ۔۔۔ ہا ، ہا ، ہا ۔۔۔ علالت ! ۔۔۔ کاش کہ سب لوگ میری طرح علیل ہوتے ۔۔۔ جائیے ، آپ ایسے نازک مزاج میری آہوں کے خریدار نہیں ہو سکتے ۔"

" مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

" مگر وگر کچھ نہیں ۔" وہ دفعتۃً جوش میں چلانے لگا ۔ " انسانیت کے بازار میں صرف تم لوگ باقی رہ گئے ہو ، جو کھوکھلے قہقہوں اور پھیکے تبسموں کے خریدار ہو ۔ ایک زمانے سے تمہارے مظلوم بھائیوں اور بہنوں کی فلک شگاف چیخیں تمہارے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں مگر تمہاری خوابیدہ

سماعت میں ارتعاش پیدا نہیں ہوا۔ آؤ، اپنی روحوں کو میری آہوں کی آنچ دو۔ یہ انہیں حساس بنا دے گی "

میں اُسکی گفتگو کو غور سے سُن رہا تھا میں حیران تھا، کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ اور اسکے خیالات اسقدر پریشان و مضطرب کیوں ہیں۔ بے اختیار ذات میں نے خیال کیا کہ شاید وہ پاگل ہے۔ اُسکی گفتگو با معنی ضرور تھی۔ مگر لہجے میں ایک عجیب قسم کی دیوانگی تھی۔ اُس کی عمر یہی کوئی پچیس تیس برس کے قریب ہوگی ڈاڑھی کے بال جو ایک عرصہ سے مونڈے نہ گئے تھے۔ کچھ اس انداز میں اس کے چہرے پر اُگے ہوئے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا، کسی خشک ردّی پر بہت سی چیونٹیاں چمٹی ہوئی ہیں۔ گال اندر کو پچکے ہوئے، ماتھا باہر کی طرف ابھرا ہوا۔ ناک نوکیلی۔ آنکھیں بڑی جن سے وحشت ٹپکتی تھی سر پر خشک اور خاک آلود بالوں کا ایک ہجوم۔ بڑے سے بھوُرے کوٹ میں وہ واقعی شاعر معلوم ہورہا تھا ــــ ایک دیوانہ شاعر، جیسا کہ اُس نے خود اس نام سے اپنے آپ کو متعارف کرایا تھا۔

میں نے اکثر اوقات اخباروں میں ایک جماعت کا حال پڑھا تھا اس جماعت کے خیالات دیوانے شاعر کے خیالات سے بہت حد تک ملتے جُلتے تھے میں نے خیال کیا کہ شاید وہ بھی اسی جماعت کا رکن ہے۔

"آپ انقلابی معلوم ہوتے ہیں "

راسپروہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔" آپ نے یہ بہت بڑا انکشاف کیا ہے۔ میاں، میں ڈکوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ چڑھ کر پکار تا ہوں۔ میں انقلابی ہوں۔ میں انقلابی ہوں ۔ مجھے روک لے جس سے بن پڑتا ہے۔ آپ نے واقعی بہت بڑا انکشاف کیا ہے ۔"

یہ کہہ کر ہنستے ہوئے وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا۔

"سکول کے ایک طالبعلم کی طرح انقلاب کے حقیقی معانی سے تم بھی نا آشنا ہو۔ انقلابی وہ ہے جو ہر نا انصافی اور ہر غلطی پر چلا اُٹھے۔ انقلابی وہ ہے جو سب زمینوں، سب آسمانوں، سب زبانوں اور سب وقتوں کا ایک مجسم گیت ہو۔ انقلابی سماج کے قصاب خانے کی ایک بیمار اور ناقوس مری بھیڑ نہیں وہ ایک مزدور ہے تنومند، جو اپنے آہنی ہتھوڑے کی ایک ضرب سے ہی ارضی جنت کے دروازے وا کر سکتا ہے۔ میرے عزیز! یہ منطق، خوابوں اور نظریوں کا نام نہیں، انقلاب ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ یہاں پر موجود ہے۔ اس کی لہریں بڑھ رہی ہیں۔ کون ہے جو اب اس کو روک سکتا ہے۔ یہ بند باندھنے پر نہ رُک سکیں گی !"

اُس کا ہر لفظ ہتھوڑے کی اُس ضرب کی مانند تھا جو سُرخ لوہے پر پڑ کر اسکی شکل تبدیل کر رہا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ میری روح کسی غیر مرئی چیز کو سجدہ کر رہی ہے۔

شام کی تاریکی بتدریج بڑھ رہی تھی، نیم کے درخت کپکپا رہے تھے شاعر میرے سینے میں ایک نیا جہاں آباد ہو رہا تھا۔ اچانک میرے دل سے کچھ الفاظ اُٹھے اور لبوں سے باہر نکل گئے۔

"اگر انقلاب یہی ہے، تو میں بھی انقلابی ہوں!"

شاعر نے اپنا سر اُٹھایا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تو پھر اپنے خون کو کسی طشتری میں نکال کر رکھ چھوڑو، کہ ہمیں آزادی کے کھیت کیلئے اس سرخ کھاد کی بہت ضرورت محسوس ہوگی ——— آہ! وہ وقت کس قدر خوشگوار ہوگا جب میری آہوں کی زردی تبسّم کا رنگ اختیار کرلیگی"

یہ کہہ کر وہ کنوئیں کی منڈیر سے اُٹھا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر کہنے لگا:۔ "اس دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو حال سے مطمئن ہیں۔ اگر تمہیں اپنی روح کی بالیدگی منظور ہے تو ایسے لوگوں سے ہمیشہ دور رہنے کی سعی کرنا اُن کا احساس ٹھہر گیا ہے مستقبل کے جان بخش مناظر اُن کی نگاہوں سے ہمیشہ اوجھل رہیں گے ...... اچھا، اب میں چلتا ہوں"

اس نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ دبایا، اور پیشتر اس کے کہ میں اُس سے کوئی اور بات کرتا وہ لمبے قدم اُٹھاتا ہوا جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔

باغ کی فضا پر خاموشی طاری تھی۔ میں سر جھکائے ہوئے خدا معلوم کتنا عرصہ اپنے خیالات میں غرق رہا۔ کہ اچانک اس شاعر کی آواز

درات کی رانی، کی دلنواز خوشبو میں گھلی ہوئی میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ باغ کے دوسرے گوشے میں گا رہا تھا:۔

زمین ستاروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔
اٹھو اور ان نگینوں کو اس کے ننگے سینے پر جڑ دو۔
ڈھاؤ، کھود دو، چیر دو، مارو!
نئی دنیا کے معمارو! کیا تمہارے بازوؤں میں قوت نہیں ہے؟
میں آہوں کا بیوپاری ہوں۔
لہو کی شاعری میرا کام ہے۔

گیت ختم ہونے پر میں باغ میں کتنے عرصے تک بیٹھا رہا۔ یہ مجھے قطعاً یاد نہیں۔ والدہ کا بیان ہے۔ کہ میں اُس روز گھر بہت دیر سے آیا تھا۔

چوری

"باباجی، کوئی کہانی سنائیے۔"

سکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور اس بوڑھے آدمی سے جو ٹاٹ پر بیٹھا اپنے استخوانی ہاتھ آگ تاپنے کی خاطر الاؤ کی طرف بڑھائے ہوئے تھا۔ کہنے لگے۔

مردِ معمّر نے جو غالباً کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اپنا بھاری سر اُٹھایا، جو گردن کی لاغری کی وجہ سے نیچے کو جھکا ہوا تھا۔

"کہانی! ——— میں خود ایک کہانی ہوں۔ مگر۔ . . ."

اس کے بعد کے الفاظ اس نے اپنے پوپلے منہ میں ہی بڑبڑائے ——— شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی۔ کہ وہ اس قسم کے فلسفیانہ نکات حل کر سکیں۔

لکڑی کے ٹکڑے ایک شور کے ساتھ جل جل کر الاؤ کے آتشیں شکم کو پُر کر رہے تھے۔ شعلوں کی عنابی روشنی لڑکوں کے معصوم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ ننھی ننھی چنگاریاں سپید راکھ کی نقاب اُلٹ اُلٹ کر حیرت میں سربلند شعلوں کا مُنہ تک رہی تھیں۔ درختوں کے خشک پتّے بڑی دلیری سے آگ کا مقابلہ کرتے ہوئے اُس شعلہ افشاں قبر میں ہمیشہ کے لئے کُود رہے تھے۔ سرد ہوا کے جھونکے کوٹھڑی کی گرم فضا کا استقبال کرتے ہوئے اسکے ساتھ بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہو رہے تھے —— کونے میں مٹی کا ایک دیا اپنی کمزور روشنی پر آنسو بہا رہا تھا۔

"کہانی —— ہر روز کہانی! کل سناؤنگا" بوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں سے لڑکوں کیطرف نگاہیں اٹھا کر کہا۔

لڑکوں کے تمتمائے ہوئے چہروں پر افسردگی چھا گئی۔ ناامیدی کے عالم میں وہ ایکدوسرے کا منہ تکنے لگے۔ گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے۔ "آج رات کہانی سُنے بغیر سونا ہوگا"۔

یکایک اُن میں سے ایک لڑکا جو دوسروں کی نسبت بہت ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتا تھا۔ الاؤ کے قریب تر سرک کر بلند آواز میں بولا:۔

"مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا —— اور وعدہ خلافی کرنا درست

نہیں ہے ـــــ کیا آپ کو کل والے حامد کا انجام یاد نہیں ۔ جو ہمیشہ اپنا اپنا کہا بھول جایا کرتا تھا"

" درست ! ـــــ میں بھول گیا تھا" بوڑھے آدمی نے یہ کہتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا ۔ جیسے وہ اپنی بھول پر نادم ہے ۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس دلبر لڑکے کی جرأت کا خیال کر کے مسکرایا ۔" میرے بچے ! مجھ سے غلطی ہوگئی ہے ، معاف کردو ـــ مگر میں کونسی کہانی سناؤں ـــ ٹھیرو ، مجھے یاد کرلینے دو" یہ کہتے ہوئے وہ سر جھکا کر گہری سوچ میں غرق ہوگیا ۔

اُسے جن اور پریوں کی لایعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی ، وہ بچوں کو وہی کہانیاں سنایا کرتا تھا ۔ جو ان کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں ۔ اسے بہت سے فضول قصّے یاد تھے ۔ جو اُس نے اپنے ایامِ طفلی میں سُنے تھے ۔ یا کتابوں سے پڑھے تھے ۔ مگر اس وقت وہ اپنے بربط پیری کے بوسیدہ تار چھیڑ رہا تھا ۔ کہ شاید ان میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اُٹھے ۔

لڑکے بابا جی کو خاموش دیکھ کر آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے ۔ غالباً وہ کسی لڑکے کا ذکر کر رہے تھے جسے کتاب چرانے پر بید کی سزا ملی تھی ۔ باتوں باتوں میں اُن میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا ۔

" ماسٹرجی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چرائی تھی۔ مگر اُسے سزا دزا تو ملی تھی "

" کتاب چرائی تھی " ان چار لفظوں نے جو پوری آوازیں ادا کئے گئے تھے۔ بوڑھے کی خفتہ یاد میں ایک واقعے کو جگا دیا۔ اس نے اپنا سپید سر اٹھایا۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے اس فراموش کردہ داستان کو انگڑائیاں لیتے ہوئے پایا۔ ایک لمحے کیلئے اسکی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی مگر ساتھ ہی وہیں غرق ہوگئی ـــ اضطراب کی حالت میں اُس نے اپنے نحیف جسم کو جنبش دے کر الاؤ کے قریب کیا۔ اُس کے چہرے کے تغیر و تبدل سے صاف طور پر عیاں تھا۔ کہ وہ کسی واقعے کو دوبارہ یاد کر کے بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے۔

الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی ـــ دیا اُسی طرح اپنے جلے نصیبوں کو رو رہا تھا۔ کوٹھڑی کے باہر رات سیاہ زلفیں بکھیرے روشنی کی طرف اپنی تاریک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ لڑکے آپس میں سکول کی باتیں کرنے میں مشغول تھے ـــ ـــ چھت مجبک کر اُن کی معصوم باتوں کو کان لگا کر سُن رہی تھی۔ دفعتاً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا : " بچو! آج میں اپنی کہانی سناؤں گا "

لڑکے فوراً اپنی گفتگو چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے ۔ الاؤ کی جلتی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر اُبھر کر خاموش ہو گئیں ۔ ـــــ ایک لمحے کیلئے فضا پر مکمل سکوت طاری رہا ۔

"اپنی کہانی سنائیں گے"؟ ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا ۔ باقی سرک کر آگ کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے ۔

"ہاں ، اپنی کہانی"، یہ کہکر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہوئی گھنی بھوؤں میں سے کوٹھڑی کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کر دیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر لڑکوں سے مخاطب ہوا ۔" میں آج تمہیں اپنی پہلی چوری کی داستان سناؤں گا"

لڑکے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ۔ اُنہیں دراصل یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ بابا جی کسی زمانے میں چوری بھی کرتے رہے ہیں ـــــ بابا جی جو ہر وقت انہیں بُرے کاموں سے بچنے کے لئے نصیحت کیا کرتے ہیں ۔

لڑکا جو ان سب میں دلیر تھا ۔ اپنی حیرانی نہ چھپا سکا ۔" مگر کیا آپ نے واقعی چوری کا ارتکاب کیا تھا"؟

"واقعی!"

"آپ اسوقت کونسی جماعت میں پڑھا کرتے تھے"؟

"نویں میں"
یہ سنکر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ اُسے اپنے بھائی کا خیال آیا۔ جو نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ وُہ اس سے عمر میں دوگنا بڑا تھا۔ اسکی تعلیم اُس سے کہیں زیادہ تھی۔ وُہ انگریزی کی کئی کتابیں پڑھا ہوا تھا۔ اور اُسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا تھا۔۔۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا۔ کہ اس عمر کا بڈھا اور اچھا پڑھا لکھا لڑکا چوری کرے؟۔۔۔۔ اُسکی عقل اس معمّے کو نہ حل کر سکی۔ چنانچہ اس نے پھر سوال کیا۔ "آپ نے چوری کیوں کی؟"

یہ مشکل سوال دیکھکر بوڑھا تھوڑی دیر کیلئے بہت گھبرایا۔۔ آخر وُہ اس کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ کہ فلاں کام اس نے کیوں کیا؟۔۔ بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا۔ "اسلئے کہ اسوقت دماغ میں یہی خیال آیا"

بوڑھے نے دل میں یہی جواب سوچا۔ مگر اس سے مطمئن نہ ہو کر یہی بہتر خیال کیا کہ تمام داستان من وعن بیان کر دی جائے۔ اس لئے کہ وہ بذاتِ خود اس سوال کا سب سے آسان جواب ہے۔
"اس کا جواب میری کہانی ہے۔ جو تمہیں سنانے والا ہوں"
"سنائیے"

لڑکے اس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سننے کیلئے اپنی اپنی جگہ برجم کر بیٹھ گئے۔ جو الاؤ کے سامنے اپنے سپید بالوں کو انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا۔ اور جسے وہ ایک بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔

مرد معمّر کچھ عرصے تک خاموش اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر اس بھولے ہوئے واقعے کے تمام منتشر ٹکڑے فراہم کر کے بولا: "ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا ہے جس پر وہ تمام عمر نادم رہتا ہے۔ میری زندگی میں سب سے بُرا فعل ایک کتاب کی چوری ہے ــــــ"

یہاں تک پہنچکر وہ رک گیا۔ اسکی آنکھیں جو ہمیشہ ایک ناقابلِ بیان انداز میں چمکتی رہتی تھیں۔ دھندلی پڑ گئیں۔ اس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

"سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے۔ جو میں نے ایک کتب فروش کی دکان سے چرائی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ قدرتی طور پر جیسا کہ اب بتیں کہاتی

سننے کا شوق ہے۔ مجھے افسانے یا ناول پڑھنے کا شوق تھا۔۔۔ نہیں خبط تھا۔ دوستوں سے مانگ کر یا خود خرید کر میں ہر ہفتے ایک نہ ایک کتاب ضرور مطالعہ کیا کرتا تھا۔ وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کی بے معنی داستانیں یا فضول جاسوسی قصے ہوا کرتے تھے۔

یہ کتابیں میں ہمیشہ چھپ چھپ کر پڑھا کرتا تھا۔ میرے والدین کو میری اس حرکت کی کوئی خبر نہ تھی۔ اگر انہیں معلوم ہوتا۔ تو وہ مجھے ہرگز ہرگز ایسا نہ کرنے دیتے۔ اس لئے کہ اس قسم کی کتابیں سکول کے لڑکے کے لئے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میں ان کے مہلک نقصان سے غافل تھا۔ چنانچہ مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔۔۔ میں نے چوری کی اور پکڑا گیا۔۔۔"

"آپ پکڑے گئے"؟ ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ہاں پکڑا گیا۔۔۔ چونکہ میرے والدین اس واقعے سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ عادت پکتے پکتے میری طبیعت بن گئی۔ اب مجھے ہر روز ایک کتاب یعنی ناول کی ضرورت لاحق ہونے لگی۔ گھر سے جتنے پیسے ملتے۔ میں انہیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوں کی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا۔ سکول کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مجھے نفرت ہونے لگی۔ بس ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سمایا رہتا کہ فلاں کتاب

جو فلاں ناول نویس کی لکھی ہوئی ہے ۔ ضرور پڑھنی چاہیئے ۔ یا فلاں کتب فروش کے پاس نئی ناولوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے ۔ وہ ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیئے ـــــ شوق کی یہ انتہا دوسرے معنوں میں دیوانگی ہے ۔ اس حالت میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا ۔ کہ وہ کیا کر رہا ہے ۔ یا کیا کر رہا ہے ۔ اسوقت وہ ایک بےعقل بچے کے مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خوش کرتے یا شوق پورا کرنے کے لئے جلتی ہوئی آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے ۔ اسے یہ پتا نہیں ہوتا کہ وہ چمکنے والی شے جسے وہ پکڑ رہا ہے ۔ اس کا ہاتھ جلا دیگی ـــــ ٹھیک یہی حالت میری تھی ۔ فرق اتنا ہے کہ بچہ شعور سے محروم ہوتا ہے ۔ اسلئے وہ بغیر سمجھے بوجھے بُری سے بُری حرکت کر بیٹھتا ہے ۔ مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہوئے چوری ایسے مکروہ جُرم کا ارتکاب کیا ـــــ یہ آنکھوں کی موجودگی میں میرے اندھے ہونے کی دلیل ہے ۔ میں ہرگز ایسا کام نہ کرتا ۔ اگر میری عادت مجھے مجبور نہ کرتی ۔

ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے ۔ جو وقتاً فوقتاً اسے بُرے سے بُرے کام کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔ یہ شیطان مجھ پر اسوقت غالب آیا ۔ جب کہ مجھے سوچنے کے لئے بہت کم وقت تھا ۔

ـــــ خیر ؎

لڑکے خاموشی سے بوڑھے کے ہلتے ہوئے لبوں کی طرف نگاہیں گاڑے اسکی داستان کو سُن رہے تھے۔ داستان کا تسلسل اس وقت ٹوٹتے دیکھکر جب کہ اصل مقصد بیان کیا جانے والا تھا۔ وہ بڑی بیتقراری سے بقایا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

"مسعود بیٹا! یہ سامنے والا دروازہ تو بند کر دینا ـــــ سرد ہوا آرہی ہے" بوڑھے نے اپنا کمبل گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

مسعود، "اچھا بابا جی" کہکر اُٹھا۔ اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"ہاں تو الحمدان جبکہ والد گھر سے باہر تھے" بوڑھے نے اپنی داستان سنانا شروع کر دی "مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا۔ اور وہ کتاب جو میں ان دنوں پڑھ رہا تھا۔ قریب الاختتام تھی۔ اسلئے میرے جی میں آئی۔ کہ چلو فلاں کتب فروش تک ہو آئیں جس کے پاس بہت سی جاسوسی ناولیں پڑی ہوتی ہیں۔

میری جیب میں اسوقت کچھ پیسے موجود تھے۔ جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کے لئے کافی تھے۔ چنانچہ میں گھر سے سیدھا اس کتب فروش کی دکان پر گیا۔ یوں تو اس دکان پر ہر وقت بہت اچھی اچھی ناولیں موجود رہتی تھیں۔ مگر اس دن خاص طور پر بالکل نئی

کتابوں کا ایک ڈھیر باہر تختے پر رکھا ہوا تھا ـــــ ان کتابوں کے رنگ برنگے سرورق دیکھ کر میری طبیعت میں ایک ہیجان سا برپا ہوگیا۔ دل میں یہ خواہش گدگدانے لگی کہ وہ تمام میری ملکیت بن جائیں۔ میں دکاندار سے اجازت لیکر اُن کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔ ہر کتاب کے شوخ رنگ سرورق پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"یہ ناممکن ہے کہ اس کا مطالعہ آپ پر سنسنی نہ طاری کر دے۔"

"معمۂ اسرار کا لاثانی شاہکار"

"تمثیل! ہیجان!! رومان!!! ـــــ سب یکجا۔"

اس قسم کی عبارتیں اشتیاق بڑھانے کیلئے کافی تھیں مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اسلئے کہ میری نظروں سے اکثر ایسے الفاظ گذر چکے تھے۔ گو اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خواہش ضرور تھی کہ میں اُن کتابوں کا مالک بن جاؤں ـــــ خیر! میں تھوڑا عرصہ کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس وقت میرے دل میں چوری کرنے کا خیال مطلقاً نہ تھا بلکہ میں نے خریدنے کے لئے ایک کم قیمت کی ناول چُن کر علیحدہ کر رکھی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ ارادہ کر کے کہ میں دوسرے ہفتے اُن

ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤں گا۔ میں نے اپنی انتخاب کردہ کتاب اٹھائی ـــــ کتاب کا اٹھانا تھا ۔ کہ میری نگاہیں ایک مجلد ناول پر گڑ گئیں۔ سرورق کے ایک کونے پر میرے محبوب ناولسٹ کا نام سُرخ لفظوں میں چھپا ہوا تھا۔ اسکے ذرا اوپر کتاب کا نام تھا:۔

"منتقم شعاعیں ـــــ کس طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے لندن کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا"

یہ سطور پڑھتے ہی میرے اشتیاق میں ایک قسم کی طغیانی آگئی۔ کتاب کا وہی مصنف، جس نے اس سے بیشتر مجھ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی ناول کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں خیالات کا ایک گروہ داخل ہو گیا۔ "منتقم شعاعیں ـــــ دیوانے ڈاکٹر کی ایجاد ـــــ کیسا دلچسپ افسانہ ہو گا!

لندن تباہ کرنے کا ارادہ ـــــ یہ کسطرح ہو سکتا ہے؟
اس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سنسنی خیز لکھی ہیں!
یہ کتاب ضرور اُن سب سے بہتر ہوگی!"

میں خاموش اس کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اور یہ خیالات یکے بعد دیگرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہے تھے ۔ میں نے اس کتاب کو اٹھایا اور کھولکر دیکھا تو پہلے ورق پر یہ عبارت نظر آئی :۔

" مصنّف اس کتاب کو اپنی بہترین تصنیف قرار دیتا ہے"۔

ان الفاظ نے میرے اشتیاق کی آگ میں ایندھن کا کام دیا۔ دفعتاً میرے دماغ کے خدا معلوم کس گوشے سے ایک خیال کود پڑا۔ وہ یہ کہ میں اس کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کر لے جاؤں —— میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش کی طرف مڑیں۔ جو ایک کاغذ پر کچھ لکھنے میں مشغول تھا۔ دُکان کی دوسری طرف دو نوجوان کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے —— میں سر سے پیر تک لرز گیا"۔

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کا نحیف جسم اس واقعے کی یاد سے کانپا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر اُس نے پھر اپنی داستان شروع کر دی:۔

"ایک لحظے کے لئے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چوری کرنا بہت بُرا کام ہے۔ مگر ضمیر کی یہ آواز مسرورق پر بنی ہوئی لانبی لانبی شعاعوں میں غرق ہو گئی۔ میرا دماغ "منتقم شعاعیں" "منتقم شعاعیں" کی گردان کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانکا۔ اور جھٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر بغل میں دبالی —— یہ کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ اور ٹانگیں بڑے زور سے کانپ رہے تھے۔

اس حالت پر قابو پا کر میں کتب فروش کے قریب گیا۔ اور اُس کتاب کے دام ادا کر دیئے۔ جو میں نے پہلے منتخب کی تھی۔ قیمت لیتے

وقت اور روپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اُس نے غیر معمولی تاخیر لگا دی۔ اس کے علاوہ وُہ میری طرف اسوقت عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہورہی تھی۔ جی ہی جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔

اس دوران میں میں نے کئی بار اُس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے اُبھری ہوئی تھی، نگاہ ڈالی ــــــ اور شاید اُسے چھپانے کی بے سود کوشش بھی کی۔ میری ان عجیب حرکتوں کو دیکھکر اُسے شک ضرور ہُوا اسلئے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرکے پھر خاموش ہو جاتا تھا۔

میں نے باقی پیسے جلدی سے پکڑے اور وہاں سے چل دیا۔ دو سو قدم کے فاصلے پر میں نے کسی کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا۔ تو کتب فروش ننگے پاؤں چلا آرہا تھا۔ اور مجھے ٹھہرنے کیلئے کہہ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کدھر بھاگ رہا ہوں۔ اسکے علاوہ میں اپنے گھر کی جانب رُخ کئے ہوئے نہ تھا۔ بلکہ میں شروع ہی سے اُس طرف بھاگ رہا تھا۔ جدھر بازار کا اختتام تھا ــــ اس غلطی کا مجھے اسوقت احساس ہُوا جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا ''

بوڑھا اتنا کہکر اضطراب کی حالت میں اپنی خشک زبان لبوں پر

پھیرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا:۔

"مسعود، پانی کا ایک گھونٹ تو پلوانا!"

مسعود خاموشی سے اُٹھا۔ اور کوٹھڑی کے ایک کونے میں پڑے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیل کرلے آیا۔ بوڑھے نے گلاس کو پکڑتے ہی منہ سے لگا لیا۔ اور ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی پی لیا "ہاں، میں کیا بیان کر رہا تھا؟" بوڑھے نے خالی گلاس کو زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ بھاگے جا رہے تھے" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

"میرے پیچھے کتب فروش "چور چور" کی آواز بلند کرتا ہوا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ جب میں نے دو تین آدمیوں کو اپنے قریب پہنچتے ہوئے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ جیل کی آہنی سلاخیں پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک ایک کرکے میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگیں۔ بے عزتی کا خیال آتے ہی میری پیشانی عرق آلود ہوگئی —— میں لڑکھڑایا اور گرپڑا۔ اُٹھنا چاہا۔ تو ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ اسوقت میرے دماغ کی عجیب حالت تھی ایک تند دھوُاں سا میرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا۔ آنکھیں فرطِ خوف سے اُبل رہی تھیں۔ اور کانوں میں ایک زبردست شور

بر پا تھا۔ جیسے بہت سے لوگ آہنی چادروں کو ہتھوڑوں سے کوٹ رہے ہیں —— میں ابھی اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کر ہی رہا تھا۔ کہ کتب فروش اور اسکے ہمراہ دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا —— اُس وقت میری کیا حالت تھی، اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے —— سینکڑوں خیالات پتھروں کی طرح میرے دماغ کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر مختلف قسم کی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ جب اُنہوں نے مجھے پکڑ لیا تو ایسا معلوم ہوا کہ آہنی پنجے نے میرے دل کو پکڑ کر مسل ڈالا ہے —— میں بالکل خاموش تھا۔ اور وہ مجھے دکان کی طرف کشاں کشاں لے جا رہے تھے۔

جیل خانے کی کوٹھڑی یا عدالت کا دروازہ دکھنا یقینی تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے میری ضمیر نے مجھ پر لعنت وملامت کرنا شروع کر دی۔ چونکہ اب جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ اور میرے پاس اپنی ضمیر کو جواب دینے کیلئے کوئی الفاظ موجود نہ تھے۔ میری گرم آنکھوں میں آنسو اُتر آئے اور میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا ——"

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دُھندلی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا —— اپنی کتاب لے لی۔ اور تھوڑی دیر نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا"۔ بوڑھے نے

اپنے آنسو کمبل سے خشک کرتے ہوئے کہا ـــ "خدا اسکو جزائے خیر دے ۔ میں عدالت کے دروازے سے تو بچ گیا مگر اس واقعے کی والد اور سکول کے لڑکوں کو خبر ہو گئی ۔ والد مجھ پر سخت خفا ہوئے۔ اور ہر ممکن طریقے سے مجھے اس مکروہ فعل پر شرم دلانے کے بعد معاف کر دیا۔

دو تین روز مجھے اس ندامت میں بخار آتا رہا ۔ اس کے بعد جب میں نے دیکھا کہ میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں لیتا ۔ اور مجھ میں اتنی قوت نہیں، کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اٹھا سکوں ۔ تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا ۔ اسوقت سے لیکر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے ـــ ہزاروں مصائب برداشت کیے ہیں ـــ صرف اس کتاب کی چوری کی وجہ سے، جو مجھے تادم مرگ نادم و شرمسار رکھے گی۔

اس آوارہ گردی کے دوران میں، میں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا ـــ مگر میں اُن پر نادم نہیں ہوں مجھے فخر ہے"!

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہو گئی ۔ اور اُس نے الاؤ کے شعلوں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنا شروع کر دیا۔

"ہاں، مجھے فخر ہے" یہ الفاظ اس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہے۔

آگ کا ایک شعلہ نہ معلوم کیوں بلند ہوا۔ اور ایک لمحہ فضا میں تھرتھرا کر پھر الاؤ کی آغوش میں سو گیا۔ بوڑھے نے شعلے کی جرأت دیکھی اور مسکرا دیا۔ پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:-

"کہانی ختم ہو گئی ہے، اب تم جاؤ ـــ تمہارے والدین انتظار کرتے ہوں گے"

"مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر فخر کیوں ہے؟ ـــ مسعود نے سوال کیا۔

"آہ! فخر کیوں ہے؟" بوڑھا مسکرایا "اسلئے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں ـــ اپنی سرقہ شدہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں میرے عزیز! ـــ بڑے ہو کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائیگا"

"میں سمجھا نہیں"

"ہر وہ چیز جو تم سے چرائی گئی ہو، تمہیں حق حاصل ہے کہ اُسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضے میں لے آؤ ـــ مگر یاد رہے تمہاری یہ کوشش کامیاب ہونی چاہئے۔ ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے"

لڑکے اُٹھے اور باباجی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازے سے باہر چلے گئے۔ بوڑھے کی نگاہیں اُن کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد وہ اُٹھا۔ اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا:۔

"آہ! اگر بڑے ہو کر وہ صرف کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے سکیں!"

بوڑھے کو خدا معلوم ان لڑکوں سے کیا امید تھی۔

اشاعت اولیں "ساقی"

... زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر
آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ
ان کو برداشت نہیں کرسکتے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابلِ
برداشت ہے ... مجھ میں جو بُرائیاں ہیں، وہ اس عہد کی بُرائیاں ہیں
میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا
جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے .... منٹو